میرا پاکستانی سفرنامہ

بلراج ساہنی

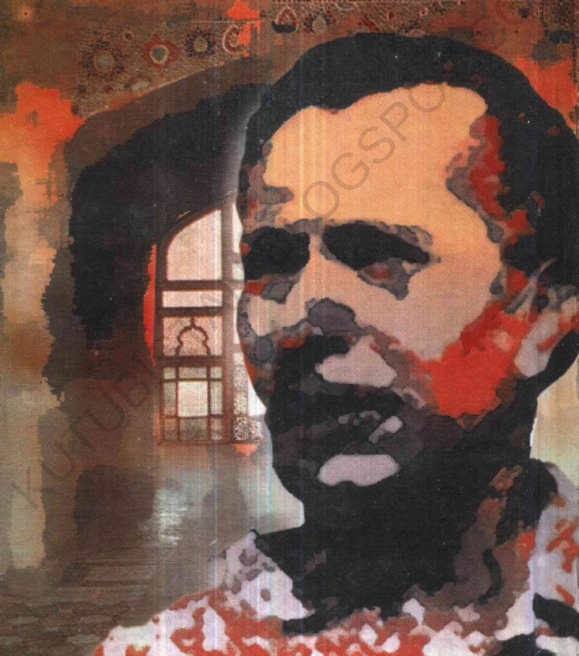

میرا پاکستانی سفرنامہ

بلراج ساہنی / یاسر جواد

KUTUBISTAN.COM

میرا پاکستانی سفرنامہ

بلراج ساہنی

مترجم

یاسر جواد

سارنگ پبلیکیشنز

الاکو مینشن، پٹیالہ گراؤنڈ، 14- لنک میکلوڈ روڈ، لاہور

KITUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تزئین و اہتمام
پروین ملک، وسیم گوہر

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب ——— میرا پاکستانی سفرنامہ
مصنف ——— بلراج ساہنی
مترجم ——— یاسر جواد
سرورق ——— فخر اللہ طاہر
سن اشاعت ——— 1998ء
قیمت ——— 100 روپے
پرنٹر ——— طیب اقبال پرنٹرز لاہور

ابتدائیہ

بلراج ساہنی کے آباؤ اجداد کا تعلق بھیرہ کے مردم خیز خطے سے تھا۔ان کے خاندان کے زیادہ تر لوگ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔بھیرہ اور سرگودھا میں اس خاندان کی کئی شاخیں آباد تھیں مگر بلراج ساہنی کے والد راولپنڈی کے چھاچھی محلے میں جا بسے تھے۔اور ان کا شمار وہاں کے روساء میں ہوتا تھا۔بلراج وہیں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور آگئے جہاں ان کے ہم جماعتوں میں فیض احمد فیض اور سردار شوکت حیات بھی شامل تھے۔

اشتراکیت کی طرف بلراج ساہنی کا فطری جھکاؤ تھا اور اپنے زمانہ طالبعلمی میں ہی ان کا یہ رجحان انہیں اپنے ہم خیال لوگوں کی تلاش پر اکساتا رہتا تھا۔یہ واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔

"جب میں کالج میں زیر تعلیم تھا سر سکندر حیات کچھ مہینوں کے لئے پنجاب کے گورنر متعین ہوئے تھے۔ایک شام ان کا لڑکا شوکت (جو میرا ہم جماعت تھا) اور میں ان کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو عجیب منظر دیکھا۔قطار در قطار بچھی دریوں پر امیر اور غریب' دونوں قسم کے ملاقاتیوں کی بھیڑ لگی تھی۔اس کے عین درمیان سر سکندر خود بڑی بے تکلفی سے حسکن تھے اور حقہ سانجھا کر رہے تھے۔جس تانگے میں ہم آئے اس کا کوچوان بھی فوراً" دری پر آبیٹھا تھا اور حقے کا کش لگا کر چلا بنا۔میں بہت متاثر ہوا اور شوکت نے اس شام اسلامی اشتراکیت پر مجھے اچھا خاصا لیکچر پلا دیا"

گویا یہ ہی زمانہ تھا جب بلراج ساہنی کی شخصیت کا رخ متعین ہوا اور آنے والے زمانے میں انہیں ایک انٹیلکچوئیل مارکسٹ(Intellectual Marxist) کے روپ میں دیکھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بلراج ساہنی فلمی دنیا میں کیسے داخل ہوئے یہ ایک علیحدہ داستان ہے مگر انہوں نے یہاں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑی "ہم لوگ"، "دو بیگھہ زمین اور کابلی والا" میں ان کے ناقابل فراموش کردار لوگوں کے دلوں پر نقش ہو گئے۔

وہ کبھی بھی "ہیرو" نہیں رہے نہ ہی ان کی شخصیت کے گرد چکاچوند کر دینے والا گلیمر کا ہالہ رہا مگر انہوں نے اپنے ادا کئے کرداروں میں یوں جان ڈال دی کہ وہ اس وقت بھی اور اب بھی ہمارے آس پاس جیتے جاگتے، سانس لیتے، زندگی کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو بلراج نے فن اداکاری میں ایک ایسا اسلوب رائج کیا جس کی پیروی کرنے والوں میں آج کے بڑے بڑے نام شامل ہیں۔

اپنی ظاہری شخصیت میں کھردرا نظر آنے والا بلراج ساہنی درحقیقت دانش و فہم سے مالا مال ایسے حساس ذہن کا مالک تھا جو قدم قدم پر اس کے سامنے کوئی سوال لاکھڑا کرتا تھا۔

ان کا اپنے آبائی وطن بھیرہ اور جنم بھومی راولپنڈی کا سفرنامہ قاری کے سامنے بھی ایسے سوال لاتا ہے جن کا جواب شاید تاریخ ہی دے سکے۔

پروین ملک

انتساب

بیگم کمال احمد

کے نام

بلراج ساہنی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

1

دہلی (9 اکتوبر 1962)

پاکستان کی سیر کا پروگرام بناتے وقت یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میری بوڑھی ماتاجی پر اس کا کیا اثر ہو گا۔ انہیں میرا جانا بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کہا "ماتا جی' ذرا سوچیں تو سہی میں گاؤں جاؤں گا' بھیرے جاؤں گا' اپنے پرانے گھر دیکھوں گا' بچپن کے دوستوں سے ملوں گا۔"

"اب کس بات کی دوستی اور کون سے گھر بار! ان جگھوں سے اب ہمارا کیا واسطہ رہ گیا ہے!"

"واسطہ تو خیر کوئی نہیں' لیکن سیر سپاٹا کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"پتر تو تو سیر سپاٹے کرتا رہے گا اور اس دوران میری جان سولی پہ لٹکی رہے گی۔ وہ بڑے مورکھ لوگ ہیں۔ ان کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

"نہیں' یہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ اب تو ہر روز لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ رتی برابر بھی کوئی خطرہ نہیں۔ اچھا چلیں' میں آپ کو ہر دوسرے تیسرے دن تار بھیج دیا کروں گا تاکہ آپ کو فکر نہ ہو۔"

گھر سے نکل تو پڑا' لیکن ماتا جی کے چہرے پر خفگی تھی۔

دہلی اسٹیشن : پلیٹ فارم پر کافی دیر بھٹکنے کے بعد معلوم ہوا کہ پاکستان والا ڈبہ گاڑی کے بالکل آخر میں لگا ہوا ہے۔ ڈبے کے پاس پہنچا تو دل بیٹھ گیا۔ بہت ہی ناقص تھا۔ یوں لگا جیسے پاکستان جانے والی سواریوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا گیا ہو' جیسے ان کے درمیان بیٹھ کر میں بھی فوراً" اپنے ہم وطنوں سے علیحدہ کر دیا گیا ہوں۔ بیٹھتے دل کے ساتھ میں نے سامان رکھوایا اور قلی کو فارغ کیا۔

اچھا' جو ہو گا دیکھا جائے گا' فی الحال تو شوق پورا ہو گیا۔ برتھ پہ ایک مسافر کا بستر بچھا تھا' لیکن وہ خود کہیں گیا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیسا آدمی ہو گا؟ اس کے ساتھ کیسے نبھے گی؟ فلم ایکٹر کو دیکھنے کی خاطر ڈبے کے آس پاس بھیڑ جمع ہو جایا کرتی ہے' آج ایک آدمی بھی نزدیک نہ آیا' جیسے پاکستان جانا کوئی بہت بڑا جرم ہو۔

ڈبے کی خستہ حالت دیکھ کر پھر دکھ ہوا۔ خراب ڈبے لگانے کا مقصد اگر پاکستانیوں کی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بے توقیری کرتا ہے تو اس میں اپنے ملک کی بھی تو بے عزتی ہوتی ہے۔ جب یہ ڈبہ لاہور پہنچے گا تو وہاں کے لوگ ہماری ریلوے کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ غیر ملک کو جانے والے ڈبے تو خاص طور پر چمک دمک والے ہونے چاہئیں تاکہ رعب پڑے۔

میرا ساتھی بھی آگیا۔ پکا سانولا رنگ' خوب قد آور اور بھرا بھرا جسم؟ کمر پہ کلیجی رنگ کی چادر' میں اسے دیکھ کر بھی گھبرا گیا اور اپنی حفاظت کے لئے چوکس رہنے کا سوچا۔ وہ بہت کٹر قسم کا پاکستانی معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک ہندو سجن تھا اور صرف جالندھر تک جا رہا تھا۔ بول چال ضلع شاہ پور کی تھی جو میرا اپنا بھی آبائی وطن ہے۔ میں بھیرے کا اور وہ سرگودھا کا نکلا۔ وہ بڑی من موجی طبیعت کا آدمی تھا۔ رات کو کافی دیر تک اس سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ بحالی آباد کاری محکمے کا افسر تھا۔ پاکستان کا چکر کئی مرتبہ لگا چکا تھا۔

گاڑی دہلی سے روانہ ہونے سے پہلے ہی ہم آپس میں کافی کھل گئے۔ ڈبے کے باہر ناظرین کی بھیڑ بھی ہمیشہ کی طرح جمع ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں میرے اندر خوف پیدا ہونے کا باعث وہم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہم جیسے پیدا ہوا ویسے مر بھی گیا۔ ڈبے کو سب سے آخر میں جوڑنے کی وجہ صرف یہی تھی کہ اسے امرتسر پہنچنے پر آسانی سے اتار کر دوسرے پلیٹ فارم پر لے جایا جا سکے۔ اس دوست نے ڈبے کے گھٹیا ہونے کا سبب بھی بتایا۔ یہ ڈبہ دراصل اس گاڑی کا حصہ ہے جو صرف امرتسر اور لاہور کے درمیان چلتی ہے۔ بمشکل تیس میل سفر ہونے کی وجہ سے ہماری ریلوے کو اچھا انجن یا اچھے ڈبے لگانے میں کوئی فائدہ نہیں۔ زیادہ تر مسافر امرتسر پہنچتے ہی دہلی' کلکتہ' بمبئی وغیرہ دور دراز مقامات کے لئے تیز رفتار گاڑیوں پہ سوار ہو جاتے ہیں۔ اس میں حیرت والی کوئی بات نہیں۔ یہ خدمت بھی صرف ہندوستان کرتا ہے' پاکستان کی کوئی گاڑی سرحد پار کر کے ادھر نہیں آتی۔

میرے ساتھی نے مجھے یقین دلایا کہ میرا پاکستان کا سفر بہت پر لطف رہے گا۔ اس نے کہا "مہمان نوازی ان لوگوں پر ختم ہے۔ آپ کو سر آنکھوں پہ اٹھا لیں گے اور آپ کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں' بے شک خوشی سے جہاں مرضی جائیں' مگر گفتگو سوچ سمجھ کر کرنا۔ خفیہ پولیس آپ کی ہر نقل و حرکت پہ نگاہ رکھے گی۔"

دوران گفتگو وہ کافی دیر چپ ہو جاتا تھا' جیسے پاکستانیوں کے بارے میں پوری طرح رائے نہ قائم کر سکا ہو یا شاید وہاں پر اپنی سیریں یاد آ رہی ہوں۔ ایک جانب وہ خوب تعریف بھی کرتا تھا اور دوسری جانب ہدایت بھی کافی مقدار میں' "ہو آئیں' آپ خود ہی

سب کچھ دیکھ لیں گے۔ اس مرتبہ تو آپ کو خوب لطف آئے گا' لیکن دوبارہ جانے کو شاید دل نہ چاہے۔"

وہ بہت ملن سار اور سمجھدار دوست تھا۔ مجھے گہری نیند سوتے دیکھ کر چپ چاپ سرحد سے پہلے کے ہی کسی سٹیشن پہ اتر گیا تھا تاکہ صبح سویرے منہ ہاتھ دھونے وغیرہ سے میری نیند خراب نہ ہو۔ لیکن جب گاڑی جالندھر پہنچی تو میں جاگ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بڑے پیار سے نمستے کہنے آیا' اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک ناول مجھے عطا کر گیا۔

10 اکتوبر' 1962ء

منہ کو تولئے میں لپیٹ کر میں نئی نویلی صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں جالندھر سٹیشن کی خوشگوار چہل پہل دیکھتا رہا۔ دل میں خیال آیا: ہم پنجابی صحت مند لوگ ہیں' لیکن ڈھیلے اور سست سے۔ اس وقت اہل جالندھر میٹھی نیند سوئے پڑے ہوں گے' یا شاید ابھی ابھی آنکھیں کھولی ہوں گی۔

گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے کمبل میں سر منہ لپیٹ کر تھوڑی دیر مزید سو لینے کا لالچ کیا۔ گاڑی کے سفر میں یہ صبح کے وقت کی نیند واقعی بڑی مزیدار ہوتی ہے۔ پاکستان یاترا کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہوئے دل میں یہ شعر نکلا:

بھکھاں لے کے چلیاں ربا لاہویں
آساں دی ٹہنی تے پھل کھڑاویں
غیر ملکیے ہو گئے میرے وطنیں
ہور اوہناں نوں نہ ہن غیر بناویں

(اے خدا! جو بھوک لے کر چلا ہوں اسے مٹانا اور امیدوں کی شاخ پہ پھول کھلانا۔ میرے ہم وطن پردیسی ہو گئے ہیں' اب انہیں مزید غیر نہ بنانا۔)

گاڑی ساڑھے آٹھ بجے امرتسر سٹیشن پر پہنچی۔ مکانات کی دیواروں پر اردو اور گورمکھی میں عجیب عجیب اشتہاری سرخیاں لکھی ہوئی نظر آئیں۔ ایک میں بڑی للکار تھی' "عینک توڑ سورما۔" خیر پتہ نہیں لاہور کی دیواروں پر کیسے اشتہار پڑھنے کو ملیں گے؟ آخری مرتبہ لاہور کا اسٹیشن تب دیکھا تھا جب دیواریں ٹوٹ رہی تھیں' شعلے بھڑک رہے تھے۔

گاڑی رکتے ہی لالوں جیسے ملبوس اور ڈاکوؤں جیسی آنکھوں والا ایک آدمی تہمد لٹکائے ہندوستانی کرنسی پاکستانی کرنسی میں تبدیل کرنے کے لئے اندر گھس آیا۔

سرمایہ داری نظام میں ہر آدمی کا ضمیر بے ایمان ہو جاتا ہے۔ میری جیب میں کل ملا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کر ایک سو دس روپے تھے۔ اگر سارے ہی تبدیل کروالوں تو ممکن ہے کسٹم والے مجھے سارے روپے ہی ساتھ لے جانے دیں۔ ویسے تو صرف پچھتر روپے ملک سے باہر لے جانے کی اجازت تھی۔ میں نے اسے سو کا نوٹ پکڑاتے ہوئے اپنے لالچ کی تصدیق کرنے کے لئے پوچھا "کیا پچھتر سے زیادہ......؟"

"ہاں جی' اور ہم آپ کو کون سا زیادہ دیں گے۔" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے چھبیس روپے ہندوستانی اور باقی رقم پاکستانی نوٹوں میں جلدی جلدی گن کر میرے حوالے کی اور چلا بنا۔ اس کی پھرتی نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ نجانے کون تھا اور کون نہیں؟ پتہ نہیں اصلی نوٹ دیئے ہیں یا نقلی؟ بھلا مجھے کسی انجان آدمی کے ساتھ سودا کرنے کی کیا جلدی تھی؟ پاکستان پہنچ کر روپے تبدیل نہیں کرائے جا سکتے؟ مجھے اس سودے سے کیا فائدہ ہو گا؟ اگر یہی ہونا تھا تو اپنے منہ سے پچھتر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر چپ رہتا تو شاید وہ چپ چاپ سو روپے ہی تبدیل کر دیتا' اپنی غیر قانونی کمیشن کاٹ کر۔ میرے بولنے سے اسے ضرور میری پارسائی پہ شک ہوا ہو گا۔ اسی لئے اس نے کھسکنے میں جلدی کی؟ وہ جعلی نوٹ تھما گیا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ اور لاہور پہنچ کر کیا ہو گا؟ بمبئی سے چلتے وقت ڈاکٹر احمد کو' جنہوں نے مجھے پاکستان آنے کی دعوت دی تھی' تار تو بھیجی تھی اور روانگی سے پہلے دہلی میں ان کا جواب بھی آ گیا تھا۔ پھر بھی پہلے ہی دن ان سے پیسے تو نہیں مانگنے نا؟ کیا معلوم انہوں نے میرے قیام کا بندوبست کسی ہوٹل میں کیا ہو۔ تکلیف نہ ہونا ہوئی تو شاید نہ ہی ہو' لیکن اگر آ گئی تو پھر؟ مجھے خود پہ غصہ آنے لگا۔ بے قاعدہ کام کرنے کا میرے دل میں لالچ ہی کیوں آیا؟ غیر ملکی سیاحت کا اتنا تجربہ ہوتے ہوئے بھی میں کیسے بھول گیا کہ سرحدی مقامات پر کئی قسم کی چار سو بیسیاں ہو جایا کرتی ہیں اور چار سو بیسی کرنے والوں کو شہہ بھی سادہ لوح لوگوں کے لالچ سے ملتی ہے...... ایک ریلوے اہلکار نے مجھے پہچان لیا' میرے پاس آیا۔ میں نے اس آدمی کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ خاص خاص آدمیوں کو نقدی تبدیل کرنے کا ٹھیکہ ملا ہوا ہے' میں نے کوئی نامناسب بات نہیں کی۔ ایک اور وہم دور ہوا۔

پلیٹ فارم پر بہت سے لوگ کیلے خرید رہے تھے۔ پاکستان میں اچھی قسم کا کیلا نہیں ہوتا' اس لئے درآمد کیا جاتا ہے۔ یہاں بھاؤ آٹھ آنے فی درجن تھا اور لاہور میں تین روپے۔ میں نے بھی پانچ درجن خرید کر رکھ لئے۔ اپنے میزبان کے لئے سوغات کا کام دیں گے۔

ڈبہ ساتھ کے پلیٹ فارم پر پاکستان والی گاڑی کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ ماحول دوبارہ کچھ

مشکل اور نقلی نقلی سا ہو گیا۔ سرحدی مقامات' پولیس اور کسٹم افسران کی موجودگی کے باعث خود ہی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔

فلم ایکٹر ہونے کی جہاں پریشانیاں ہیں وہیں فائدے بھی کم نہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ کہ ہر کوئی بڑے شوق اور بے غرضی کے ساتھ مدد کرتا ہے۔ خاکی وردی والے افسروں نے مجھے بہت ہی پیار سے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا' "آپ اپنے سامان کی پرواہ نہ کریں۔ ڈبے میں ہی ہم اس کی جانچ پڑتال کر لیں گے۔"

میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھا رہا اور ان کی کارروائی دیکھتا رہا۔ بڑا سر کھپانے کا کام ہے اور ڈیوٹیاں لمبی ہیں۔ سواریاں زیادہ سے زیادہ کپڑا ہندوستان سے لے کر جانے کی کوشش کرتی ہیں' کیونکہ یہاں کی نسبت وہاں مہنگا ہے۔

ایک بانکا سا مسلمان گھبرو بڑی چالاکی کے ساتھ افسر کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے سلک کی نئی نکور چادر کمر کے گرد باندھ رکھی تھی' جسے وہ یقیناً بیچ دے گا۔ اس کے سامان میں دس بارہ چادریں مزید تھیں۔ افسروں نے پانچ معاف کر دیں' لیکن وہ تین اور چادریں بلا ٹیکس لے جانا چاہتا تھا۔ وہ کبھی ہاتھ جوڑتا' کبھی افسر کی ٹانگیں دابنے لگتا۔ میرٹھ کے علاقے کا آدمی تھا شاید۔ ہیر سٹائل بہت خوبصورت' منہ میں پان' بوسکی کی قمیض' بٹن کھلے۔ اس کی حرکتیں کسی نکھرے ستھرے ایکٹر جیسی تھیں۔ آخر کار جب سامان پاس ہو گیا تو اس نے اپنی جیب میں سے خوبصورت سگاروں کا پیکٹ نکالا اور سگار بانٹنا شروع کئے۔ کوئی بھی لینے کو تیار نہ تھا' لیکن وہ زبردستی ہماری جیبوں میں ایک ایک سگار ڈالتا جاتا تھا اور کہتا' "کسی اور کو پلا دینا۔" جنگلے سے باہر جا کر اس نے اپنا سامان گاڑی میں رکھا اور پھر واپس جنگلے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا آدھا خاندان پاکستان میں تھا اور آدھا ہندوستان میں۔ وہ اپنے کسی رشتے دار کی شادی پر کچھ دن کے لئے لاہور جا رہا تھا۔ مجھے افسروں نے بتایا کہ اس گاڑی کے مسافروں میں بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی ہی ہوتی ہے۔

گاڑی چلی تو میری آنکھیں سرحد دیکھنے کے لئے پھٹنے لگیں۔ ایک سیکورٹی افسر آ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ گاڑی کو سرحد تک پہنچا کر اتر جائے گا۔ دوسری طرف پاکستانی افسر اس کی جگہ لے لے گا۔

اٹاری سٹیشن کا ڈرائیور اور فائر مین مجھے انجن میں بیٹھ کر سرحد دیکھنے کی دعوت دینے آئے۔ یہ کیسا منظر ہو گا؟ کیا دونوں طرف پولیس اور فوج کا پہرہ ہو گا؟ کس قسم کی حد بندی کی گئی ہو گی؟ کیا کوئی خاردار تار بچھی ہو گی؟ یہ خاردار تار کتنی دور تک بچھی ہو گی؟ انجن

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تانگے میں جتے ہوئے کسی بوڑھے گھوڑے کی مانند گھسٹ کر چل رہا تھا اور اردگرد وسیع مارو تھل سا نظر آ رہا تھا۔

اچانک کچھ سپاہی ایک درخت تلے لیٹے آرام کرتے نظر آئے۔ تبھی ڈرائیور نے کہا "بس جی' یہی حد ہے!" اور تھوڑی دیر بعد میں کھیتوں میں مسلمان کسان' ان کی عورتیں اور بچے دیکھنے لگا۔ اب میں پاکستان میں تھا' مسلمانوں کے دیس میں' ایک غیر ملک میں! لیکن یہ لوگ تو میں نے پہلے سے دیکھ رکھے ہیں۔ دیہاتیوں کے بارے میں سوچتے وقت انہی لوگوں کی تصویر میرے من میں آتی تھی۔ یہ لوگ نہ تو نئے نکلے اور نہ ہی بیگانے...... مجھے کون سا انوکھا پن دیکھنے کا اس قدر انتظار تھا؟ ہاں ایک فرق ضرور تھا' کہیں سکھ سردار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

پاکستان کا پہلا سٹیشن واہگہ آ گیا۔ گاڑی رکی۔ میں پلیٹ فارم پہ اترا۔ جب اپنے ڈبے میں جا رہا تھا تو ایک سفید داڑھی والے بزرگ نے کھڑکی میں اٹھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا' "صاحب' چند الفاظ اس ناچیز سے بھی سنتے جائیے۔ میری عمر کے آدمی کو فلمیں دیکھنے کا بہت کم شوق ہوتا ہے' مگر آپکی فلمیں میں ہمیشہ دیکھتا ہوں اور آپ کو دیکھ کر مجھے جو مسرت ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا۔ آپ انسانی جذبات کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ آپ کی فلمیں اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے بلند ہوتی ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنے انسانی معیار کو کبھی مت چھوڑیئے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔"

میں بھونچکا اس کی جانب دیکھتا ہی رہ گیا' میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ لیکن جب اپنے ڈبے میں پہنچا تو دل میں جذبات کا طوفان سا اٹھ رہا تھا۔

ڈبے میں ایک ٹھیٹھ لاہوری بولی بولنے والا پاکستان سکیورٹی افسر آ گیا۔ بس یہی ایک فرسٹ کلاس ڈبہ تھا' اسی لئے شاید افسر یہیں آ کر بیٹھتے تھے۔ کوئی تیس سال عمر تھی' دیکھنے میں کافی خوبصورت' کافی سفید چٹا۔ اس نے میرا پاسپورٹ دیکھا' ایک فارم پر کرنے کے لئے دیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے نام سے واقف ہے' لیکن اس بات کو ظاہر نہیں کر رہا۔ اس بات پر بہت مسرت ہوئی کہ اس نے میرے ساتھ انگریزی یا اردو بولنے کی کوشش نہ کی۔ اس کی پنجابی سن کر مجھے بہت مزہ آ رہا تھا اور پردیسی پن کا احساس گھٹتا جا رہا تھا۔

"لاہور میں آپ کہاں ٹھہریں گے جی؟" اس نے پوچھا۔

میں نے بڑے شوق سے جیب میں سے ایک تار نکال کر دکھائی جو مجھے امرتسر سے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

2

گاڑی رکی۔ میں نے کھڑکی میں سے نگاہ دوڑا کر لاہور سٹیشن کی برجیوں کو دیکھا۔

مجھے کبھی لاہور زیادہ یاد نہیں آیا تھا۔ دل گاؤں کے لئے زیادہ تڑپتا تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ ایک تو میں بچپن سے ہی حد نگاہ پر پہاڑ دیکھنے کا عادی تھا۔ جب گاؤں چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور کے نیو ہاسٹل میں آیا اور اس کی چھت سے کسی طرف بھی کوئی پہاڑ نہ دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے قدرت کی کسی بہت بڑی نعمت سے محروم ہو گیا ہوں۔ وہ گھبراہٹ مجھے آج تک نہیں بھولی۔

دوسرے، گرمیوں میں لاہور کی آندھی اور سردیوں میں دھواں میرے لئے ستم کا روپ تھے۔ ہمارے گاؤں میں کچھ دیر کے لئے آندھی جھکڑ چلتا تو پھر پانی برسنے لگتا۔ مطلع

لاہور — چوبرجی کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ملنے والے کسان

صاف شفاف ہو جاتا اور کھڑکیاں دروازے ٹوٹنے کی مصیبت بھی اچھی لگنے لگتی۔ راتیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔

اس کے برعکس لاہور میں ایک مرتبہ غبار اٹھتا تو کئی کئی دن سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک صبح نیو ہاسٹل کی چھت سے بستر گول کر کے جب نیچے اپنے کیوبیکل میں آیا تو آئینے میں چہرہ دیکھ کر ڈر گیا، کالا سیاہ ہو چکا تھا۔ اور یوں سردیوں میں دھوئیں سے آنکھیں ہی نہیں، جسم کی ہڈیاں بھی دکھنے لگتی تھیں۔

پھر پنڈی ایک چھوٹا شہر تھا۔ انگریز راج کے بد اطوار معاشرتی زندگی پر پوری طرح حاوی نہیں ہوئے تھے۔ محلے داریوں اور برادریوں کے میل ملاپ قائم تھے، دوستیوں میں خلوص اور مٹھاس تھی۔ شرافت اور نرم دلی کی قدر و قیمت تھی۔ فرقہ واریت کا زہریلے پودا نشو و نما ضرور پا رہا تھا، لیکن ابھی مضبوط نہیں ہوا تھا۔ لیکن لاہور بڑا مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے نئے فیشن کی "تہذیب" کے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ یہاں دولت اور اثر و رسوخ کے نظریات نے پرانے ڈھنگ کی وضعداریاں سب ختم کر دیں تھیں۔ دوسروں کو کچل کر آگے بڑھنے کے لئے سب طرح کے حیلے، اچھے اور برے، جائز تسلیم کئے جا چکے تھے۔ ماحول

راولپنڈی — بلراج ساہنی صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے

میں حد درجے کا کورا پن آ چکا تھا اور طالب علم کی زندگی پر بھی قدرتی طور پر اس کا اثر تھا۔ کھیلوں میں اور پڑھائی میں کیا ہر طرف ہی عیارانہ چالیں چلی جاتی تھیں' جو نئے لڑکوں کے لئے انوکھی اور پریشان کن تھیں۔ فرقہ وارانہ کھینچا تانی تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ مستقبل کی بھیانک ممکنات کا منظر صاف دکھائی دے جاتا تھا۔

مطلب یہ کہ لاہور کی رنگین کالجیٹ زندگی کا بھرپور لطف اٹھاتے ہوئے بھی میں اس کے بے قاعدہ پن کے احساس سے کبھی عاری نہ ہو سکا۔ ایک خلاء سا میں ہمیشہ محسوس کرتا رہتا تھا' جس کا سبب نہ تو میں سمجھتا تھا اور نہ ہی مجھے کوئی سمجھانے والا تھا۔ میں سوچتا کہ شاید لاہور کے پانی میں ہی کوئی نقص ہو گا۔ میں لاہور کو کبھی اپنا نہیں کہہ سکا تھا۔

لیکن آج لاہور سٹیشن کے گیروے رنگ کے برج دیکھ کر نجانے کیا ہوا؟ یوں لگا جیسے ان کے لئے میری روح جنم جنم سے ترس رہی تھی۔ اندر کے کسی دبے ہوئے چشمے میں سے پیار اور احترام پھوٹ نکلا۔ فٹ بورڈ سے پاؤں اتارنے سے پہلے میں نے ہاتھ کے ساتھ زمین کو چھو کر پرنام کیا۔

ڈاکٹر نذیر احمد (پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور) مجھے لینے کے لئے یونیورسٹی کی ایک اہم میٹنگ میں سے اٹھ کر آ گئے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ نے کسٹم' پاسپورٹ وغیرہ کی مشکل گھاٹیاں منٹوں میں پار کروا دیں' بلکہ افسروں نے بڑے احترام سے مجھے چائے بھی پلائی۔ ڈاکٹر نذیر احمد بڑے خوش تھے کہ ان کے مہمان کو سامان وغیرہ کھولنے کی زحمت نہیں کرنا پڑی' لیکن میں اس جلد بازی سے ذرا بھی مطمئن نہ تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک ایک پلیٹ فارم پہ پھرنے کی تمنا پوری کروں۔

شام کے چار بجے تھے۔ کافی دیر سو لیا ہے میں نے۔ جسم میں تازگی آ گئی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً" سڑکوں پہ نکل جاؤں۔ گورنمنٹ کالج کے ٹاور کی وہی پرانی گھڑی ٹن ٹن کرتی ہے' شاید گیارہ بجائے ہیں۔ اس کی وہی پرانی بے پروائی جس کے متعلق طرح طرح کے لطیفے گھڑے جاتے تھے۔ اس کی ٹن ٹن سن کر بڑے عجیب خیال جاگ اٹھتے ہیں۔ یادیں اجاگر نہیں ہوتیں ـــــ بلکہ آپ گہرا سا ٹھہراؤ' تسکین سی' جیسے کڑکتی دھوپ میں دور دور پروازیں کر کے لوٹنے والا بھوکا پیاسا پنچھی گھونسلے کا لطف اٹھا رہا ہو۔ دور سے تانگوں کی گھنٹیاں' کالج کے سامنے پھل فروشوں کی صدائیں.......

میں جس بنگلے میں ٹھہرا' وہ اس زمانے میں جی ڈی سوندھی صاحب کی رہائش گاہ تھا۔ وہی دھیمی دھیمی روشنی والے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے' جالی دار دروازے۔ غسل خانے میں

تولیہ پھیلانے والا ریک۔ یہ سب ب"ہوائی جنکشن" فلم میں بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ بے شک فلم بڑی گھٹیا تھی' پھر بھی بمبئی کے سینما ہال میں آج سے دس سال بیٹھے ہوئے میں لاہور کے لئے بے قرار ہو گیا تھا۔

ہمارے وقت میں ان بنگلوں کے اندر گھستے ہی ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں۔ پروفیسروں کا دھماکے دار انگریزی رعب ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ بات بالکل نہیں۔ باہر سے گھنٹی بجتے ہی ڈاکٹر نذیر احمد خود بھاگ کر باہر جاتے ہیں' کوئی دربان نہیں' وردی والا پہرے دار نہیں۔ نذیر صاحب نے مجھے اپنا سونے والا کمرہ دے دیا۔ اس میں کپڑوں کی الماری نہ ہونے کا انہیں افسوس تھا۔ کہنے لگے' "یار' میں نے وارڈ روب نہیں رکھی ہوئی' تجھے تکلیف ہو گی۔ دراصل میرے پاس اتنے کپڑے ہی نہیں۔ یونہی خوامخواہ کون مصیبت لے۔ اگر تجھے ضرورت ہو تو تکلف نہیں کرنا' منگوا دوں گا۔" یہ سن کر مجھے کتنا اچھا لگا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے لئے کبھی میں ایسے پرنسپل کا بھی تصور کر سکتا تھا؟

ڈاکٹر نذیر کمرے میں داخل ہوئے اور کہا' "آئیں' باہر لان میں بیٹھ کر چائے پئیں۔" ان کے انداز میں کوئی تکلف نہیں' جیسے میری خواہشات کو بن کے سمجھتے ہوں۔ ہم باہر لان میں جا بیٹھے۔ وہی مخملیں گھاس' سڈول بدن جیسی تنومند مٹی' کیاریوں میں گلاب کے مہکتے ہوئے پھول' درختوں کے گھنے سائے۔ میں بھلا کیسے بھول گیا کہ پنڈی سے لاہور آ کر میری آتما نے پہلی مرتبہ کھلا پن محسوس کیا تھا۔ کیسے بہانے بنا بنا کر میں لاہور کی جانب بھاگ نکلتا تھا؟......

ایک حادثہ یاد آیا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد میں پنڈی میں اپنے والدین کی زیر سرپرستی کپڑے کا بیوپار کرتا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میرا بھائی ۔بھیشم اب بھی گورنمنٹ کالج میں تھا' ایم اے کر رہا تھا۔ اس کا خط آیا' "کالج کا نیا ڈرامہ اگلے ہفتے اور اتوار کو پیش کیا جا رہا ہے' میں بھی حصہ لے رہا ہوں۔ ضرور آئیں دیکھنے۔" والد (پتا جی) مجھے بے قابو بیل جان کر ذرا مضبوطی سے باندھتے تھے۔ ان سے اجازت ملنا کو ناممکن دیکھ کر میں نے ہفتے کی دوپہر کو ایک خط لکھ کر ان کی میز پر رکھ دیا' جس کا لب لباب یہ تھا کہ جیسے سرکاری دفاتر میں ہفتے کو نصف دن اور اتوار کو پورا دن چھٹی ہوتی ہے اسی طرح بیوپاری دفاتر میں بھی ہونی چاہیے' اور یہ بندے کی من مرضی پر منحصر ہونا چاہیے کہ وہ چھٹی کیسے گزارے اور اس اصول کے تحت اپنی بیوی کو ساتھ لے کر "ویک اینڈ" کے لئے جا رہا ہوں' سوموار کو صبح ڈیوٹی پہ حاضر دفتر ہو جاؤں گا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

میں جانتا تھا کہ پیچھے گھر میں بڑا ہنگامہ ہو گا۔ بیٹے کا اجازت لئے بغیر جانا معاف کیا جا سکتا ہے' لیکن بہو کا ہرگز نہیں۔ لیکن دونوں الھڑ تھے۔ واپس آ کر دیکھا جائے گا۔

لاہور پہنچا' ڈرامہ دیکھا' بڑی عیش کی۔ دوسری رات باقی کی رقم سے دو تھرڈ کلاس کی ٹکٹیں خریدیں۔ بارہ بجے کی گاڑی پکڑی۔ بھیڑ بہت تھی۔ بیوی دمو کو علیحدہ زنانہ ڈبے میں بٹھایا۔ رات بھر مجھے اس کا خیال نہ آیا' حالانکہ نئے خاوند کو اپنی ذمہ داریوں کا بہت احساس ہوتا ہے! صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی اور اگلا سٹیشن آتے ہی میں ڈبے کی جانب چل پڑا۔ لیکن وہاں پہنچ کر دیکھا' ڈبہ بالکل خالی۔ ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ میں نے اسے دمو کا سارا حلیہ بیان کیا' لیکن اس نے تو ویسی کسی لڑکی کو دیکھا نہیں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرسوں کھل اٹھی۔ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ گاڑی فوراً" چل دی اور میں بے ہوشی کی سی حالت میں پھر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اگلے سٹیشن تک جو میرا حال ہوا رب کسی کو نہ دکھائے۔ مجھے کیا موت آئی تھی اسے الگ ڈبے میں بٹھانے کی؟ نجانے کیا واقع ہوا؟ ایک مرتبہ گم ہوئی وہ کہاں ملے گی؟ مظلوم کی قانون کے آگے بھی تو کوئی شنوائی نہیں۔ کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ اب میں گھر جا کر کیا منہ دکھاؤں گا؟ سارا شہر الٹا مجھے ہی لعنت ملامت کرے گا۔۔۔ پھل مل گیا فیشن کے ماروں کو' جو اتنی قیامت برپا کر رکھی تھی۔ تحفظ اور بے فکری ہمارے دیس میں کتنی بے وقعت چیز ہے' اس کا مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا۔ کس قدر تھوڑے سے لوگوں کے لئے یہ بنائی گئی تھی؟ اور وہ بھی بدقسمتی سے اگر کوئی غلط قدم اٹھا لیں تو کالی رنگت والے ہونے کی پوری سزا انہیں بھی بھگتنی پڑے گی۔ آسرا نہیں' سہارا نہیں' پوچھ گچھ نہیں۔ انسان کی وقعت ایک کیڑے مکوڑے کے برابر بھی نہیں تھی......

نیم جان حالت میں اگلے سٹیشن پر پھر بھاگ دوڑ کی۔ معلوم ہوا کہ گاڑی کے اگلے حصے میں ایک اور زنانہ ڈبہ بھی ہے۔ اس تک گیا۔ کھڑکی میں دمو پنڈی کے انتظار میں بنی سنوری بے فکری کے عالم میں بیٹھی تھی۔ مجھے بے حال دیکھ کر بہت حیران ہوئی اور ہنسی۔ رات کو ڈبہ خالی ہوتا دیکھ کر وہ ایک دو عورتوں کے ساتھ اس دوسرے ڈبے میں آ گئی تھی۔ جتنی جلدی دنیا کھوئی اتنی جلدی مل بھی گئی۔ لیکن میں نے آئندہ انوکھی آوارہ گردیوں سے توبہ کر لی۔ اس ہول کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔

کیا اب بھی پنڈی اور لاہور کے عوام کے لئے تحفظ صرف رسوخ اور اپروچ والے لوگوں کو ہی نصیب ہے؟ میرے دیس ہندوستان میں کیا حال ہے؟ سادہ لوح عوام اس آزادی کے دور میں بھی کہیں یتیم ہی تو نہیں؟

موٹر میں بیٹھ کر ہم سیر کو نکلے۔ ضلع کچہری والے موڑ سے راوی روڈ پہ آ گئے۔ گورنمنٹ کالج کے پھاٹک کے پاس ایک سنگ میل ہوا کرتا تھا۔ نیو ہاسٹل سے سڑک پار کر کے کالج جاتے ہوئے میں خود بخود اس کی طرف نگاہ مار کے گزرتا تھا' "راولپنڈی 178 میل' گوجرانوالہ 39 میل' جہلم 118 میل۔" اب اس سنگ کا جسم بڑھ کر چوگنا ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی فاصلوں کی تفصیل درج ہے: کراچی 897 میل' ملتان 263 میل...... وہ گزر گئی سنٹرل ٹریننگ کالج والی سڑک! اسی جانب ریٹیگن روڈ سے میرے پھوپھا کا گھر تھا۔ ان کے پاس ہی پروفیسر ساہنی رہتے تھے۔ ایک شاید پارسیوں کا مندر تھا' جس کے ساتھ والی گلی میں سے گزر کر پروفیسر گل بہار سنگھ اور پروفیسر مدن گوپال سنگھ کے گھر جایا کرتے تھے۔ یہ بھاٹی سے آنے والی سڑک مل گئی۔ وہ "گرودت بھون" آ گیا' دیکھوں تو سہی یہاں کیا بورڈ لگا ہوا ہے؟ ڈرائیور موٹر کو اتنا تیز کیوں دوڑا رہا ہے؟

کالج کے زمانے میں راوی کی سیر سائیکل یا تانگوں پہ کیا کرتے تھے۔ آج یہ موٹر بے رحمی سے ذہن میں جغرافیہ بدلتی جا رہی ہے۔ جو جگہیں میرے تصور میں دور دور تھیں وہ ہاتھ ہاتھ بھر کے فاصلے پہ آ گئی ہیں۔ پلک جھپکتے میں جامعہ مسجد کے عالیشان گنبد نظر آ گئے' پھر منٹو پارک' اب اسے محمد اقبال پارک کہتے ہیں۔ لاہور کی تصویر یک دم مختصر ہو گئی۔ گول باغ کی گولائی بڑے نمائشی انداز میں شہر کے اردگرد گھوم رہی تھی۔ گرو ارجن دیو کی سمادھ' مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ' پرانا قلعہ' ساری جگہوں کا کل وقوع نئے سرے سے ذہن میں بٹھایا۔ بھلا دور طالب علمی میں ان کے پاس آتے ہی کب تھے؟ تب میں صاحب بہادر تھا۔ گوروں کی طرح سولا ہیٹ پہنے مال روڈ اور میکلوڈ روڈ سے ہی چمٹا رہتا تھا۔ بہت ہوا تو کبھی نسبت روڈ کا چکر بھی لگا لیا۔ لیکن اس مرتبہ پکا دیسی آدمی بن کر لاہور کی گلیوں کے چکر لگاؤں گا...... شہر کی فصیل میں' ایک پرانا دروازہ نظر آیا (نام بھول گیا...... شاید کابلی دروازہ؟) مجھے شہر کو بقرار نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھ کر ڈاکٹر نذیر نے تجویز پیش کی کہ اس دروازے کے پیچھے' ایک تنگ گلی میں' ان کا آبائی مکان ہے' وہاں جا کر ایک رات گزاری جائے۔ کتنا خوش ہوا تھا میں! پاکستان آنے کا سب سے بڑا لالچ مجھے یہی تو تھا۔ جی بھر کے اپنی پنجابی بولی سنوں۔ ماجھی' لہندی' پوٹھوہاری' میری اپنی ماں بولیاں جن سے جدا رہ کر میں نے زندگی کا اتنا بڑا حصہ گزار دیا تھا۔ کتنا بڑا گناہ کیا میں نے؟ لیکن پھر بھی انہوں نے مجھے بھلایا نہیں۔ مجھے پچھتاتے اور اپنی جانب لوٹتے دیکھ کر انہوں نے بانہیں پھیلا کر مجھے گلے لگا لیا۔ چلو بھر بھر کر ہیرے موتی میری جیبوں میں بھرنے شروع کر دیئے' جیسے بچپن میں ماں

ریوڑیوں' پنیوں اور چلغوزوں سے میری جیبیں بھرا کرتی تھی۔ کتنی پیاری ہے لاہور والوں کی بولی۔ یہاں یہ کتنی تازہ تازہ لگتی ہے' جیسے کھیتوں میں لہراتی سنہری سرسوں' جیسے کنوؤں کے بہتے پانی۔ بمبئی میں میرے بے شمار دوست یہی بولی بولتے ہیں' لیکن وہاں یہ کانوں کو باسی باسی سی لگتی ہے۔

ریڑھوں میں بانکے گھوڑے جوت کر شام کے وقت سیر کے لئے نکل کھڑے ہونا ماجھے کے چھیلوں کا خاص شوق ہے۔ ململ کا کرتا' یا سفید تہمد' ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے۔ کتنے حسین گورے گورے' اور معصوم سے چہرے ہیں ان کے۔ یوں جلدی جلدی قریب سے گزر جاتے ہیں (دوست کی موٹر گاڑی ہے ورنہ گلی دے ڈالوں!)۔ وہ گزر گیا! کتنا خوبصورت مورت جیسا گھبرو تھا! اتنا دلکش آدمی تو کم ہی دیکھا ہو گا کہیں دنیا میں! وارث کی بات یاد آئی۔

نازاں پالیا دودھ ملائیاں دے

من نے کروٹ لی' "چھوڑ اوئے یار' یہ تو مسلمان ہیں' غیر ملکی ہیں۔ انہوں نے کتنے ہی ہندو مارے' کتنی آگ لگائی' کتنی عورتیں بے عزت کیں' کیسے بھول گئے وہ باتیں؟

"ہاں! اچھا' اب میں غیر سمجھ کر ہی دیکھوں گا انہیں..... لیکن ہائے کروں تو کیا کروں؟ یہ پھر مسلمان نہیں نظر آتے' غیر نہیں لگتے۔ جو بداعمالی جس نے کی خود ہی حساب دے گا مجھے تو کسی نے منصف نہیں بٹھایا؟"

باغبانپورہ میں کافی نئی آبادی ہے۔ سوہنے سوہنے اور پکے پکے رنگ' بنگلے' آمدورفت بھی بہت لیکن بہت پرانی وضع کے لاہوری تانگے نہیں نظر آ رہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ اب ہر طرف پشاوری تانگے کا رواج ہو گیا ہے۔ پنڈی میں صرف تین سواریاں بیٹھتی ہیں' یہاں ابھی تک چار کا دستور ہے۔ ہم پنڈی والے لاہوری تانگے کو ڈچکوں ڈچکوں کہہ کر مذاق کیا کرتے تھے۔ آخر پنڈی کی جیت ہوئی نا؟ بڑی خوشی ہوئی سوچ کر۔ لیکن اگلے پل دل میں وہی پلٹنا..... "تجھے کیا تعلق پنڈی اور لاہور سے؟ خوامخواہ دخل در معقولات کر رہا ہوں۔"

"اچھا۔ میں بیگانہ اور بیگانہ سہی۔ لیکن پنڈی اور لاہور کو' یہاں کے تانگوں کو جی بھر کے دیکھنے کی تو آزادی ہے نا مجھے؟ سلامت رہیں سدا۔ ان کو گرم ہوا نہ لگے۔ ان کی مرادیں پوری ہوں' ان کے بچے جیتے رہیں۔"

وہ سکھ نیشنل کالج کی عمارت تھی۔ اس حساب سے وہ ہوئی نہر کی جانب سے آتی سڑک..... ہاں ٹھیک ہے..... مغل پورے کا انجینئرنگ کالج۔ اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل

گیا ہے۔ یہاں سے نزدیک ہی میاں میر کا مزار ہے' جس نے امرتسر میں سکھوں کے سنہری ہری مندر کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ دارا شکوہ کا گرو تھا وہ۔ دارا شکوہ' جس نے اپنشدوں کے تراجم فارسی میں کرائے تھے۔ لیکن اب اس قسم کے تاریخی واقعات کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔

شالامار باغ جا پہنچے' جہاں پچیس سال ہوئے میں نے پہلی مرتبہ سگریٹ نوشی کی تھی' اور کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا تھا۔ میں اور میرا ایک پیارا دوست خواہ مخواہ سائیکل پکڑ کر شالامار کی طرف چل پڑتے تھے۔ دل میں دبی ہوئی امیدیں------ آج ضرور کوئی حسینہ دکھائی دے گی' میری جانب آرزو مندی کے ساتھ دیکھے گی۔ پھر ہماری دوستی ہو جائے گی' زندگی میں کوئی سرور بھرا جھلارا آئے گا۔ لیکن شام تک امیدوں کے سارے محل ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ سوائے بیکار چکر لگانے' پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف گھورنے' اور سگریٹ پھونک کر جینٹل مین دکھانے کے' کچھ حاصل نہ ہوتا۔ ہاں' البتہ سائیکل پہ بارہ میل کا چکر لگانے سے بھوک ضرور تیز ہو جاتی' جسے مٹانے کے لئے کبھی "سٹیفنز" اور کبھی "لورینگ" کی جانب چل پڑتے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے خوابیدہ حسرتوں کے ناگ پھر بیدار ہو جاتے۔ کیا پتہ ریسٹورنٹ میں ہی کوئی حسینہ ناز و ادا منتظر ہو؟

آئندہ کا سورج اب گذشتہ کے پہاڑوں کے پیچھے جا ڈوبا تھا۔ محض دھیرے دھیرے پھیکی پڑتی یادوں کی سرخی آکاش پہ رہ گئی تھی۔ کر لئے جو رومانس کرنے تھے' کھیل چکے سب کھیلیں۔ اب تو بقول غالب ؎

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ڈاکٹر نذیر احمد نے مجھے اپنے خیالوں میں چھوڑ دیا ہے۔ چائے منگواتے ہیں۔ چپ چاپ سرو کے ایک پودے تلے' گھاس پہ بیٹھ کر چسکی لگاتے ہیں۔ شام کی خاموشی کی آوازیں سنتے ہیں۔ رہ رہ کر آپ بیتیاں پھلجڑیوں کی مانند پھوٹ پھوٹ پڑتی ہیں' جیسے آج یہاں "میلہ چراغاں" ہو رہا ہو!...... آخر پیار بھی تو ہوا تھا ایک لڑکی سے' ساری عمر اس ایک ہی نام کی مالا جپی تھی (ورد کیا تھا!) اس محراب دار دروازے کی دونوں اطراف بڑے چھوٹے چھوٹے سے چبوتروں (تھڑوں) کے اوپر ہم نے باری باری ایک دوسرے کے فوٹو کھینچے تھے...... کیسے اس کے سارے گھرانے کو شالامار پکنک پہ چلنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا کر منایا تھا..... کتنی منتیں' کتنی سیاست' کتنی سماجتیں.....

اسی دروازے میں سے کبھی دیہات کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں میلہ چراغاں کی

رونقیں دیکھنے آتے ہوں گے۔ وہ' وہاں بادشاہ بیٹھتا ہو گا۔ تالاب کے عین درمیان' دونوں کناروں پہ بنی ہوئی بارہ دریوں میں سے' چراغوں اور فواروں کی جھلمل میں اپنے زری ملبوسات کو غلطاں کرتے ہوئے' گلوکار اور نرتکیاں چل کر حضور کے سامنے پیش ہوتے اور اپنا ہنر دکھاتے ہوں گے.....

پھر من میں وہی بے تکی آوازیں۔ لاہور والا شاہ جہاں دراصل پاکستانی تھا۔ آگرہ والا شاہ جہاں ہندوستانی تھا...... لیکن نہیں بار بار یہ تمنائیں اور خواہشات اٹھنے نہیں دینی چاہئیں۔ سیاست کی پیچیدگیوں سے میرا کیا واسطہ؟ میں ایک مہمان تھا' ڈاکٹر نذیر میرے میزبان تھے۔ اس قسم کے سوال دل میں اٹھانا ہی ناشائستہ بات ہے۔ چاہے مجھے کتنا ہی پیار کیوں نہ ہو' پھر بھی اب یہ پرایا شالامار ہے۔ اسی حساب سے ڈاکٹر نذیر بھی پرائے ہیں۔ لیکن بار بار کیوں ان سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے' "نذیر صاحب" آپ کی اور میری شناسائی زیادہ پرانی نہیں۔ پچھلے برس آپ بمبئی آئے اور میں آپ سے ملا' بس۔ پھر آپ کے پاس بیٹھ کر مجھے اتنا سکون' اتنا صبر کیوں نصیب ہوتا ہے' جو بمبئی میں میرے لئے نایاب ہے؟"

ابھی نہیں' لیکن پوچھوں گا ضرور۔ ڈاکٹر نذیر احمد ایک غیر معمولی انسان ہے' بے شک!

واپس باہر آ کر موٹر میں بیٹھتے وقت ایک نو عمر سی مانگنے والی' ساتھ کوئی آٹھ برس کی بچی' انتہائی میلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے' ہاتھ پھیلا کر منت سماجت کرتی' "ویرا جیتا رہے' کبھی گرم ہوا نہ لگے۔ اللہ تیری مرادیں پوری کرے' اقبال بلند کرے' تیرے بچے جئیں......"

یہ بدبخت اکھیاں کیوں برس پڑتی ہیں۔ یہ عورت میری کیا لگتی ہے؟ وہ پاکستانی' میں ہندوستانی.......

3

لاہور' 11 اکتوبر 1962ء

رات کو بڑے شوق سے فیصلہ کر کے سویا کہ صبح سویرے سیر پہ نکل جاؤں گا۔ لیکن وقت آنے پر جوش ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بستر میں لیٹے لیٹے خیال آنے لگے' جس دیس کے وجود کا انحصار فرقہ پرستی پر ہو' اس میں بندہ کس طرح کھل کر سانس لے سکتا ہے' خصوصاً" جب وہ خود پسندیدہ فرقے کا آدمی نہ ہو؟ فرقہ پرستی سے کتنی نفرت کی جاتی تھی' اس کے نتائج سے کتنا ڈر لگتا تھا' لیکن آخر میں یہاں وہ ایک تسلیم شدہ اور قانون کی جانب سے منظور کردہ حقیقت بن گئی۔ اگر ہندوستان محض ہندو کا ملک تسلیم کر لیا جائے' ہر وقت مندروں کے گھنٹے بجا کریں اور گھور گھور کر جنجھوؤں اور بالوں والوں کا شمار کیا جائے' تو کیا وہ رہنے کے قابل ملک رہ جائے گا؟"

پھر دل میں سوال اٹھا' "کیا اب تک بھارت کو ہم صحیح معنوں میں سیکولر ڈیموکریسی بنا سکے ہیں؟ چاہے بہت زیادہ کٹر مذہب پرست نہیں لیکن پھر بھی اکثریتی فرقے کا بندہ ہوں: مجھے کیا معلوم' اقلیتی فرقے اپنے آپ کو ہندوؤں کی مانند محفوظ اور آزاد محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟ کبھی میں نے اس مسئلے پر گہرائی میں جا کر جانچ پڑتال کی ہے؟ کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان عوام کیسے رہتے ہیں ان کے نکتہ نظر کیا ہیں؟ قرآن شریف کا مطالعہ بھی بمبئی سے چلنے کے کچھ دن پہلے کیا تھا' وہ بھی شاید اپنی حفاظت کی غرض سے مجبور ہو کر۔ لیکن اس کے ساتھ میرے من کے کتنے شکوک مٹ گئے تھے' حضرت محمدؐ اور ان کی تعلیمات کے لئے دل میں کتنا احترام پیدا ہوا تھا۔ لیکن ہنوز میرے اندر کتنی جہالت ہے' کتنے تعصبات ہیں۔ ہم لوگ کتنے جتن کرتے ہیں؟ کیا اب بھی ہمارے دیس میں اچھوتوں کے ساتھ جانوروں والا سلوک نہیں کیا جاتا؟ ممکن ہے ہندوؤں کے چلے جانے سے پاکستان کے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مسلمانوں نے شکر ادا کیا ہو۔ ان کی کوئی بات بھی تو ہندوؤں کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ ہر وقت ہندوؤں کی نکتہ چیں نگاہیں انہیں چھیدتی رہتی تھیں' ان کی عزت نفس کو ڈستی رہتی تھیں.......

"لیکن دوسری جانب یہ بھی تو ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کا انداز ترقی پسندانہ ہے۔ وہاں قانونی طور پر ایک فرقے کو بالادستی حاصل نہیں' چاہے اندر کھاتے کتنی ہی برائیاں موجود ہیں؟ وہاں کبھی نہ کبھی جہالت دور ہونے کی' دلوں کے وسیع ہونے کی' آس تو کی جا سکتی ہے؟ لیکن پاکستان.....؟"

رات کو لوہاری دروازے سے پھلاہ کا داتن خریدا تھا۔ ان کی جانب دھیان جاتے ہی شوق پھر بیدار ہو گئے۔ دیکھوں تو سہی پنڈی کی پھلاہ کی برابری کرتی ہے یا نہیں؟ گل فروشوں کی دوکانوں کے قریب زمین پر بیٹھے ایک بندے نے کیسی سریلی تان بلند کی: "اوئے بھلو۔ا۔۔ن! باؤ جی نوں پھلاہ کی گٹھی نکال کر دے ذرا!"

انگیٹھی سے داتنیں اٹھا کر غسل خانے میں چلا گیا۔ شیو کی' نہایا دھویا اور پھر کیمرے کندھے پر لٹکائے باہر نکل کھڑا ہوا۔

اپنے پرانے نیو ہاسٹل کے سامنے سے گزرا۔ رک جاؤں کچھ دیر؟ فوٹو کھینچ لوں؟

نہیں' نہیں کہیں کوئی دیکھ کر خوامخواہ شک نہ کرنے لگے۔ میرا کون محافظ ہے یہاں؟ واقعی کتنا ڈرپوک ہوں میں۔ یہ تو میرا اپنا ہاسٹل ہے۔ خیر' ہاسٹل بھی تو اب میری طرح تھکا تھکا اور پرانا پرانا ہو گیا ہے۔ وقت نے اسے بھی میری طرح عمر رسیدہ کر دیا ہے۔ دیکھ کر افسوس کی بجائے تسکین ہوئی۔

ہاسٹل کے سامنے والا تھانہ ابھی تک موجود تھا۔ اس کے احاطے میں' تھکن دور کرنے کی خاطر' کسی کسی رات کو سپاہی اپنے گاؤں کے ماہیے اور ڈھولے گاتے' جو ہمیں انگریزی علم موسیقی کے خدمتگار طالب علموں کے لئے "ڈراؤنے" تھے۔ ہم چلا چلا کر انہیں "شٹ اپ" کہتے' غیر مہذبانہ نقل اتار کر چڑاتے' ہر ممکن طور پر ان کا مزہ خراب کر کے خوش ہوتے۔

تھانے کے قریب سے ٹریننگ کالج کی جانب جانے والی گلی میں سے گزر کر اپنی بھوآ (پھپھو) کے گھر جایا کرتا تھا۔ آج بھی وہاں سے گزرا' لیکن سہم سہم کر' کہ کہیں میری چال ڈھال سے ہندوؤں والا مخصوص انداز ظاہر نہ ہو جائے۔ لیکن گلی کی غریبانہ سی آبادی کو' جو

بن بلائے سر پہ آن کھڑی ہوئی صبح کے استقبال میں ڈرے ہوئے گھونگے کی مانند آہستہ آہستہ سینگ باہر نکال رہی تھی' میری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ موڑ پہ حلوائی کی دوکان' جہاں سوڈا واٹر' سگریٹ' پان اور اخبارات وغیرہ بھی فروخت ہوا کرتے تھے' جوں کی توں موجود تھی۔ جس پنٹرے سے ہندو حلوائی اٹھ کر چلا گیا وہاں مسلمان حلوائی آ کر بیٹھ گیا' بس اتنا ہی فرق تھا۔ یہ شاید "ادھر" کسی پنٹرے سے اٹھ کر آیا ہو گا! مسلمان کو حلوائی کے روپ میں دیکھنا عجیب لگتا تھا۔

پارسی عبادت خانے کے سامنے میری بھوآ کا گھر بھی جوں کا توں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ مہرہ مجھے خاموشی سے پہچاننے اور اپنی قربت جتانے لگا۔ فوٹو کھینچ کر اس کے جذبات کی بے توقیری کرنا مجھے مناسب نظر نہ آیا۔ اس سے آگے پروفیسر رچی رام جی کی کوٹھی دیکھی۔ وہاں میری چھوٹی بھوآ رہتی تھی۔ آج کل وہ ڈیرہ دون میں ہے۔ آج اس کی کوٹھی تو دیکھ لی' لیکن تقسیم کے بعد اسے ملنے کا موقع تاحال نصیب نہیں ہوا۔ ان کوٹھیوں سے ایک سڑک مویشی ہسپتال والی سڑک کو جاتی ہے۔ اس گلی میں میرے سنسکرت کے پروفیسر گل بہار سنگھ جی کا گھر تھا' جو اب سورگ باسی ہو چکے ہیں۔ بڑا پیار کرتے تھے وہ مجھے۔ مویشی ہسپتال والی سڑک پہ پہنچ کر اپنے انگریزی کے ہر دل عزیز پروفیسر مدن گوپال سنگھ جی کی کوٹھی دیکھی' جس کی ممٹی پہ "اوم" اسی طرح کھدا ہوا تھا۔ وہ خود تقسیم کے فسادات میں مارے گئے تھے۔

یہ طواف مکمل کر کے پھر واپس کچہری روڈ پہ آ گیا۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج کے پھاٹک پر اب "اسلامیہ کالج" کا بورڈ لگا ہوا ہے' لیکن عمارت کی محراب پر دیوناگری رسم الخط میں "دیانند اینگلو ویدک کالج" اسی طرح موجود ہے۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج کے ہوسٹل کے سامنے سے گول باغ کی جانب گزر کر پھر سرخی والا ایک اشتہار لگا ہوا تھا۔

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی ہماری بہو بیٹیوں کو اٹھا کر
لے جائیں؟"

ہو سکتا ہے کہ کسی سیاسی پارٹی کا نعرہ ہو' یا پھر امرتسر کی طرح یہاں کے کسی حکیم نے بھی "عینک توڑ" قسم کا سرمہ تیار کیا ہو؟ صحیح بات ہے۔ اگر بینائی اچھی ہو گی تو "بہو بیٹیوں" کی رکھوالی اچھی طرح ہو سکے گی' اور وہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں اغواہ ہونے کے خطرے سے بچ جائیں گی۔ دور حاضر کی تہذیب میں ہر شئے اشتہار ہوتی جا رہی ہے۔ بہرحال اشتہار کو پڑھنے کی مجھے کوئی خواہش نہ ہوئی۔

سامنے سے ایک پاگل آدمی آتا دکھائی دیا' جو لیڈر کے انداز میں سر ہلا ہلا کر شرع اور

حدیث کے نکتے بیان کر رہا تھا۔

یونیورسٹی گراؤنڈ والے موڑ پر چائے پانی کی چھوٹی سی دوکان نظر آئی۔ ملیشئے رنگ کی شلوار قمیض پہنے ایک نو عمر لڑکا میز کرسیاں صاف کر رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا' "کیوں بھئی' چائے کی ایک پیالی ملے گی؟"

جواب میں وہ ہنسنے لگا' جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس کے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا' بدستور کرسیاں صاف کرتے کرتے آخر بولا' "ابھی دودھ نہیں آیا۔"

اس کا گورا چٹا چہرہ سرخی مائل ہوتا جا رہا تھا۔

میں اس کی بیوقوفی پہ حیران ہوتا ہوا آگے چل دیا۔ کم بخت ہنسا کس بات پہ تھا؟ بہت سوچنے کے بعد ایک ہی وجہ ذہن میں آئی۔ وہ ضرور میری پچیس برس سے پردیسوں میں آوارہ گردی کے باعث زنگ آلود پنجابی بول چال پہ ہنسا ہو گا۔ میں نے چائے کا مطالبہ گاہکوں کی طرح نہیں بلکہ فقیروں کے انداز میں کیا تھا۔

سڑک کے اس پار ایک چائے والا زمین پہ دوکان لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد غریب گاہکوں کی کچہری لگی ہوئی تھی۔ مجھے یہاں کس نے پہچاننا تھا؟ ہمت کر کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس مرتبہ ذرا رعب اور محاورے سے فرمائش کی' "بھلوان جی' اک چاہ دا پیالہ دی بنا کے دینا ذرا۔"

لیکن نشانہ پھر خطا گیا۔ یہ یو پی کے علاقے کا بندہ نکلا۔

"حضور نمکین ہے۔" وہ بڑی نرمی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں' نمکین ہی پی لیں گے' ہندی بولتے وقت میں نے وقتی آسانی محسوس کی۔

چائے ایک دم بے مزہ تھی' اور پیالے گندے۔ لیکن انوکھے تجربے کا کچھ نہ کچھ لطف بھی ضرور ہوتا ہے۔ گاہکوں کے جھرمٹ میں سے ایک آدمی نے' جو بہار کے علاقے کا لگتا تھا' میری آمد کے باعث رکی ہوئی بات چیت کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

"اجی صاحب' جو مرد اکیلا کم سے کم سو عورتوں پر حاوی نہ ہو سکے بھلا وہ مرد کا ہے کا؟ ہمارے علاقے میں ایک خانزاد تھے۔ ساٹھ سال کی عمر میں بارہ سال کی لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پہلی بیویوں سے لڑکے لڑکیوں اور پوتوں نواسوں کی تعداد

سینکڑوں تک پہنچتی تھی۔ پھر بھی چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم تھے۔ چھوکری کو دو تین برس خوب کھلایا پلایا' جوان کیا' پھر کیا' ہر سال بچہ جنتی تھی۔ ایک حکیم صاحب ان کو روزانہ ایک چاول کے دانے برابر گولی کھانے کو دیا کرتے تھے۔ لیکن شرط یہ کہ ساتھ میں خوراک ہو۔ بھئی کیا کیا کھاتے تھے وہ' کیا نہ کھاتے تھے! اجی اگر خوراک تگڑی نہ ہو بھی انگوں میں زہر پھیل جائے دوائی کا' اتنی تیز تھی کمبخت۔ پچاس برس سے کم عمر کا آدمی تو اسے کھا نہیں سکتا' وہیں ختم ہو جائے....."

اس آدمی کے انداز میں بڑی جان پہچان تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کافی دیر سے سننے والوں کی جنسی اشتہاء کو ابھار رہا ہے۔ لیکن اس کی باتوں کا اثر جھنڈ سے ذرا سا الگ ہو کر بیٹھے' حقہ پیتے' ایک ملازم سے شخص پر کچھ اور طرح کا ہوا۔ وہ درمیان میں روٹھے ہوئے انداز سے اپنی درانتی اور چارے کی گٹھری اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر چلتا بنا' "ہاں میاں' سب دولت کی برکتیں ہیں....."

منڈلی پر اس بات کا کافی اثر پڑا' اور خاموشی چھا گئی۔ پھر کافی لمبے بالوں اور داڑھی والے ملنگ نے باآواز بلند اردو کے شعر پڑھنے شروع کر دیے۔

یونیورسٹی گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ' درختوں کی جانی پہچانی چھاؤں کا لطف اٹھاتا' چوبرجی پہنچ گیا۔ سامنے سے جٹوں کی ایک جھومتی ڈولتی ٹولی آ رہی تھی۔ ان کے ساتھ ذرا بات چیت کرنے کا لالچ ہوا۔ گاؤں ناتھن باواں والے کے رہنے والے تھے وہ۔ شہر خرید و فروخت کرنے جا رہے تھے۔ میں نے انہیں روک کر اپنا تعارف کرایا اور تصویر لینے کی اجازت مانگی۔ انہیں حیرت میرے بھارتی یا ہندو ہونے پر اتنی نہیں تھی جتنی اس بات پہ کہ ایک پتلوان والا باؤ پینڈوؤں سے دوستی گانٹھنے کی تکلیف کر رہا ہے۔ بمبئی شہر کے متعلق اور ہندی فلموں کے بارے میں انہوں نے مجھ سے ایک سانس میں کتنے ہی سوالات پوچھ لئے' اور پھر تصویر کھنچوانا بھی منظور کر لیا۔ بڑی پرلطف ملاقات تھی وہ۔

کنیئرڈ کالج کے نزدیک ایک کوٹھی میں کبھی میں پورا سال خیمہ لگا کر رہا تھا------ نیو ہاسٹل میں سے دھکیلے جانے کی وجہ سے۔ دھکیلے جانے کی وجوہات میں سے ایک یہ تھی------ ڈارمیٹریوں میں ٹینس کھیلنا اور شیشے توڑنا۔ کوٹھی میرے ایک یار ہم جماعت کی تھی۔ اس کے والد بڑے بارسوخ آدمی تھے۔ کوٹھی کی بڑی زمین تھی۔ اس کے ایک کونے میں خیمہ لگانے کی اجازت آسانی سے مل گئی۔ لیکن یہ سودا میرے دوست کے والد کو مہنگا پڑا۔ جب بھی وہ گھر میں کوئی بڑی پارٹی کرتے تو خیمے میں کالج کے لڑکوں کی پارٹی مفت میں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہو جایا کرتی۔

کوٹھی کے پھاٹک کے پاس کھڑے ہو کر میں خالی پڑی جگہ کو دیکھ دیکھ کر ان رنگیلے دنوں کو یاد کرنے لگا۔ کبھی کبھی چھٹی والے دن کوٹھی کے احاطے میں کرکٹ بھی ہوتی تھی۔ بیٹسمین کی جو شارٹ گیند کو اچھال کر میرے خیمے کے اوپر لا پھینکے' چھکا گنا جاتا ہے' اور ہر چھکے سے گرد کی ایک موٹی تہہ خیمے کے اندر پڑے ہوئے سامان پر جم جاتی تھی۔ لیکن میں ناراض ہونے کی بجائے خود بھی اسے کھیل کا ایک کراماتی جزو سمجھتا تھا۔

کوٹھی کے دونوں پھاٹک دن رات کھلے رہتے اور میرا خیمہ ایک پھاٹک کے بالکل قریب تھا' اس لئے دل کی کسی گہری تہہ میں چور ڈاکو کا خطرہ موجود رہتا تھا۔ ایک رات ٹامس ہارڈی کا غمگین ناول "ٹیس" پڑھتے پڑھتے دیر سے سویا۔ نیند بھی کمبخت آئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد برے سپنے آئے اور آنکھ کھل جاتی۔ ایک مرتبہ نیم خوابی کی حالت میں یوں نظر آیا جیسے خیمے میں چور گھس آیا ہے اور عجلت میں ادھر ادھر چلتے ہوئے کوئی چیز ڈھونڈھ رہا ہے۔ پہلے تو میں ڈر سے سہم گیا' پھر ہڑبڑا کر انگریزوں والی آواز میں چیخنا شروع کر دیا۔۔۔ "کون ہائے' یو بلڈی ڈیم فول' کالا آدمی' چلا جاؤ ایک دم' نہیں تو ہم گولی مار دے گا۔"

لیکن اس دھونس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ چور اسی طرح بے دھڑک ہو کر چل پھر رہا تھا۔ اب مجھ سے ایک بڑی غلطی ہو گئی۔ میں نے مچھر دانی کی اندر والی طرف لگے بجلی کے لیمپ کا بٹن دبا دیا۔ جس کی وجہ سے باہر کچھ نظر آنے کے بجائے صرف مچھر دانی کے اندر ہی جگمگ ہو گئی۔ اب تو مجھے اپنی جان بچانے کی پڑ گئی۔ فوراً بتی بجھا کر خیمے کی دیوار والی طرف سے کھسک کر چارپائی کے نیچے چھپنا چاہا۔ ننگ دھڑنگ تھا۔ فرش پر لیٹے ہوئے شدید سردی میں نہ جانے کتنی دیر ٹھٹھرتا رہا' لیکن دشمن کا حملہ نہ ہوا' اور آہستہ آہستہ میرے ہوش بھی ٹھکانے آ گئے۔ معلوم ہوا کہ باہر سڑک پر لگے بجلی کے کھمبے کی روشنی خیمے کے دروازوں پر لٹکی ہوئی اور ہوا سے ہلتی ہوئی چقوں میں چھن کر دو ٹانگوں کے چلنے کا وہم پیدا کر رہی تھی۔ اتنی دیر میں میرا واویلا سن کر گھر کے بندے بھاگ کر آ گئے' اور مجھے بہت شرمسار ہونا پڑا......

آج اس واقعہ کو یاد کر کے پھر شرمسار ہو رہا تھا۔ اپنے کسی ہم وطن کو ڈرانے کے لئے۔۔۔ چاہے وہ چور ہی ہو۔۔۔ فرنگیوں کی طرح بھونکنا کتنی گھناؤنی سوچ کا نتیجہ تھا۔

چوک میں پہنچ کر سمجھ نہ آئی کہ اب آگے کیا کروں۔ وقت گزارنے کے لئے بدیسی

سیلانیوں کے مانند چوبرجی کو اندر باہر سے بڑے غور سے دیکھنے لگا' حالانکہ دیکھنے والی کوئی خاص چیز وہاں نہ تھی۔ پھر ایک تانگے والے کو "مزنگ مزنگ" پکارتے سن کر اس کے تانگے میں جا بیٹھا۔ تیز دھوپ نکل آئی تھی' آمدورفت چار گنا بڑھ گئی تھی۔ ایک بس سٹاپ پر کالے برقعے پہنے کھڑی ہوئی کالجیٹ لڑکیوں کا' پنچھیوں جیسا' بڑا سا جھرمٹ تھا۔ ایسے جھرمٹ میں نے کل بھی کئی جگہوں پر دیکھے تھے۔ مانا کہ برقعہ پوشی رجعت پسندانہ بات سہی' لیکن لڑکیوں کے لئے تعلیم اتنی ہی عام لگتی ہے جتنی دوسرے ممالک میں۔ ساتھ یہ برقعہ پرانے زمانے کے خیمہ نما برقعوں جیسا نہیں۔ یہ حسن کو چھپاتا ہے یا اور بھی نکھارتا ہے۔۔۔ سوچنے کی بات ہے! بسیں' موٹریں' ٹیکسیاں ملتان روڈ پر دور دور تک دکھائی دے رہی تھیں' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرف شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔

تانگے والا کون کونسی سڑک سے گزر کر مزنگ جائے گا' یہ نقشہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہاں سے ایک سڑک لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی۔

انسان کی زندگی دراصل ایک زندگی نہیں' وہ پڑاؤ پڑاؤ پر ختم کی ہوئی لاتعداد زندگیوں کا مجموعہ ہے۔ اور میں نے لارنس گارڈن کو جاتی ہوئی سڑک پر اپنی ایک ایسی ہی زندگی کو پایا تھا......

ایسی ہی ایک صبح تھی۔ میں اور میری محبوبہ اپنے اپنے گھر سے سیر کا بہانہ بنا کر نکلے' بھٹکتے بھٹکتے' اس سڑک پر آ گئے تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس دن' ہونٹوں کی پیاس اور تلخی کے باعث بات کرنا بھی مشکل محسوس ہوتا تھا۔ "سکیمیں بنانے کی ضرورت نہیں' اگر بھاگنا ہے تو اسی وقت بھاگ چلو۔ ایک مرتبہ گھر واپس جا کر مجھ سے پھر کہیں جایا نہیں جائے گا۔" لیکن مجھے تیاری کے بغیر بھاگنا ناممکن نظر آتا تھا اور وہ پوچھتی تھی' "کس قسم کی تیاری؟"

آج پچیس برس بعد پلٹ کر دیکھتے ہوئے مجھے اپنی بے وقوفی اور اس کے سیانے پن پر حیران ہونا پڑتا ہے۔

وہ بچی' جس نے میری ایم۔ اے کی ڈگری کے مقابلے میں بمشکل میٹرک پاس کیا تھا' نہ جانے کیسے جان گئی تھی کہ جہاں جانے کی بازی لگانی ہو وہاں سکیمیں بنانے اور سہارے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پریم کے سپنوں کے محل سے باہر چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت تھی۔ زندگی کا نہ مجھے کوئی تجربہ تھا نہ اسے' پھر بھی تاریکی میں کودنے کا اسے ڈر نہیں تھا' میں جھجک رہا تھا۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ منصوبے بنانے کی باتیں کر کے دراصل

میں اپنی بزدلی کو چھپا رہا تھا۔

بڑی بھیانک حالت تھی ہماری' اور اسی کی مناسبت سے وہ سڑک بھی بہت بھیانک تھی' جیسے اشاروں سے ہونی کے جال دکھا رہی ہو! ہر طرف قبرستان' خانقاہوں کے کھنڈر' منحوس درختوں پر بیٹھی گدھوں کی قطاریں' کانٹوں جیسی تیکھی اور مردہ جانوروں کے جبڑوں جیسے چمکتی ہوئی کیکر کی خاردار باڑیں....

میں نے دیکھا کہ تانگے والا اس سڑک پر آ گیا ہے۔ میں نے گھبرا کر اسے روکا---- "نہیں بھائیا' اس سڑک سے نہیں' کسی ہور طرف سے چل۔"

"جی اوہ' آگے ہم الٹے ہتھ مڑ جائیں گے' اس سڑک کو کیا کرنا ہے ہم نے؟"

ویسی کی ویسی ویران پڑی تھی وہ سڑک' ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ ہاں' لیکن قبرستانوں میں میری "زندگی" کی قبر کا اضافہ ضرور تھا۔

جھنگ 12 اکتوبر 1962ء

گھیانا گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کرسی بچھا کر میں ڈائری کے ورق سیاہ کر رہا ہوں۔ سامنے بیری کا درخت ہے' جس کے نیچے ایک تانگہ' اور گھوڑی کو زمین پر بیٹھے چارہ ڈالتا ہوا تانگے والا' میرا انتظار کر رہے ہیں۔ لکھتے لکھتے پل پل میری نگاہ ان کی طرف اٹھتی ہے اور ہر مرتبہ بھرپور تسکین سی محسوس کر کے لوٹ آتی ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں

جھنگ کے علاقہ میں ایک شادی کا منظر

جھنگ آیا ہوں۔ ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا بسوں کے اڈے سے یہاں آئے۔ اڈہ شہر سے باہر ہے' اور یہ گیسٹ ہاؤس بھی۔ مطلب یہ کہ ابھی میں نے شہر کا بالکل کچھ نہیں دیکھا' اور نہ ابھی تک کسی سے میری شناسائی ہوئی ہے۔ پھر بھی عجیب قسم کا ذہنی سکون محسوس ہو رہا ہے' جیسے دور دراز کے سفر سے اپنے گھر واپس آیا ہوں۔ میں نے ہندوستان کا چپہ چپہ چھانا ہے' بڑے شوق اور امنگوں کے ساتھ۔ لیکن کسی نئے شہر میں پہنچ کر پہلے ایک دو دن ضرور بیگانگی محسوس کرتا ہوں' لیکن یہاں کوئی بیگانہ پن محسوس ہی نہیں ہوتا۔ گیسٹ ہاؤس مجھے اپنے گھر جیسا لگ رہا ہے۔ پہنچتے ساتھ ہی بڑے اطمینان سے نہایا دھویا' ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ پھر ڈائری لکھنے بیٹھ گیا' جیسے کسی بات کی جلدی نہ ہو' دماغ کی ساری بے چینیاں ختم ہو گئی ہوں۔ کیوں نہیں' میرے باپ دادے کا دیس' جہاں میں بچپن میں کھیلا' اب یہاں سے اتنا ہی دور رہ گیا ہے جتنا بمبئی سے پونا۔ بیری گواہ ہے' سبز کچور طوطے گواہ ہیں' آکاش اور پون گواہ ہیں۔

صبح چھ بجے ڈاکٹر نذیر احمد کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر لاہور سے روانہ ہوا تھا۔ انہوں نے لائلپور (فیصل آباد) ایگریکلچرل کالج کے لڑکوں کا امتحان لینے جانا تھا۔ لاہور میں ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا' ان گنت دوستوں سے ملنا تھا۔ بمشکل ڈیڑھ دن ہی تو وہاں گزارا تھا' لیکن موٹر پر اتنی لمبی سیر پر نکلنے کا لالچ میں روک نہ سکا۔ دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ جھنگ' بھیرہ' پنڈی وغیرہ کی یاترا ختم کر کے آخری تین چار دن پھر لاہور میں ہی گزاروں گا۔ اور واقعی اس موٹر کی سیر کی کئی ناقابل فراموش یادیں تھیں۔ صبح کاذب کے وقت راوی کی سطح بھاپ سی' جیسے تازہ تازہ دوہے ہوئے دودھ کی بالٹی میں سے اٹھتی ہے۔ راوی کی بڑی بڑی چھاتی۔ بارہ دری' جو پہلے دریا کے کنارے پر ہوتی تھی' اب بیچ میں آ گئی ہے' اور عجب بہار دکھاتی ہے۔ میں نے فوٹو کھینچنے کی غرض سے موٹر رکوائی' لیکن پہریدار نے منع کر دیا۔ کچھ دیر کھڑے ہو کر دونوں خاموشی سے نظارہ دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر نذیر نے بتایا کہ آس پاس کے بیلوں میں پیدل لمبی سیریں کرنے کا انہیں بہت شوق ہے۔ قصے کہانیوں میں باروں اور بیلوں کے متعلق بڑا لکھا تھا' لیکن معلوم نہ تھا کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔ اپنی جہالت کو ظاہر کرنے میں شرم ضرور محسوس ہوئی' لیکن پوچھ ہی لیا۔ سفر کے دوران ڈاکٹر نذیر نے باریں بھی دکھائیں اور بیلے بھی۔ بیلے وہ جہاں بھینس چراتے ہوئے رانجھے کو ہیر چوری کھلانے جایا کرتی تھی۔ باریں وہ جن پر مرزا خان کی بکی جھکڑ کی مانند دوڑتی تھی۔

(جہالت دور کرنے کا ایسا ایک اور جتن کچھ دن بعد جھنگ سے بس میں سرگودھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جاتے ہوئے بھی کیا۔ ڈرائیور سے پوچھا "کیوں جی، ڈاچی اور لونٹ دا کی فرق ہوندا ہے؟" اور جواب میں وہ ہنس کر بولا "جی اوہ دودھ دیندی ہے۔"

ڈاکٹر نذیر احمد کے منہ سے کئی اور یاد رکھنے کے قابل الفاظ سنے ---- تھمنے، تج (اس کا مطلب اب پھر بھول گیا ہوں) نور پاک دا ویلہ (یعنی صبح صادق)۔ ڈیرہ بابا نانک کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا "یہ ہمیشہ سے بڑا مردم خیز علاقہ رہا ہے۔" کتنا خوبصورت لفظ تھا مردم خیز! موڑ پر اردو میں ایک بورڈ لگا تھا ---- "ڈیرہ بابا نانک صاحب جی!" آگے جا کر ٹوبہ ٹیک سنگھ نام کا گاؤں آیا۔ ڈاکٹر نذیر نے بتایا کہ وہ بھی بڑے اونچے درجے کا بندہ گزرا ہے۔

لاہور سے لائلپور کی بیچ راہ میں ایک گاؤں میں چائے پینے کے لئے رکے۔ ڈرائیور نے چائے نہ پی۔ اپنی ملی جلی دوآبی ماجھی بولی میں کہنے لگا "ہم تو جی بہت تھکے ہوں تو دودھ کا پیالہ بھر کے بس اتنا سا رنگ (یعنی چائے) ڈال لیتے ہیں۔"

لیکن گاؤں کی مالی حالت بھی پہلی نظر میں بہت پتلی نظر آتی تھی اور نہ ہی بہت اچھی۔ آزادی سے پہلے مغربی پنجاب کے گاؤں جیسے ہوا کرتے تھے اب بھی ویسے ہی لگتے تھے۔ دیہات میں تعمیراتی منصوبوں کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ لیکن دعوے کے ساتھ کہنے کے لئے موٹر کی دھول اڑاتے ہوئے گزر جانا کافی نہیں، گہرے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔

چائے والی دوکان پر ایک قسم کی مٹھائی بھی بک رہی تھی، جو ہمارے بھیرہ میں شادی بیاہ کے موقعہ پر رشتہ داروں میں بانٹی جاتی تھی۔ عرصے سے اس کا نام یاد کی لہروں پر تیرتا تھا، لیکن پکڑ میں نہیں آتا تھا، محسوس کیا، پوچھنے پر معلوم ہوا اسے "بدانہ" کہتے ہیں۔ بڑی تسلی ہوئی۔

بلراج ساہنی اپنے پرانے گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علموں کے ساتھ

4

پرسوں شالامار باغ میں چائے پیتے ہوئے ڈاکٹر نذیر سے پوچھنے کا جی چاہا کہ اس کا نظریہ حیات کیا ہے؟ جب موٹر دوبارہ چلی تو یہ سوال پوچھ ہی لیا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ڈاکٹر نذیر کی درویشانہ سادگی اور صاف گوئی سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ ان کی خاموشی میں بھی ایک طرح کی للکار تھی، جیسے کہہ رہی ہو "انسانی پیار ہی دنیا کی سب سے قیمتی اور عظیم چیز ہے۔ باقی سب دکھاوا ہے، اور دکھاووں میں پڑنا زندگی کو خراب کرنا ہے۔"

نذیر صاحب کی موٹر پرانے ماڈل کی بے بی ماریس ہے (ایک ایسے ملک میں جہاں موٹروں کی درآمد پر کوئی کنٹرول نہیں اور ہر طرح کے نئے ماڈل بڑے سستے بھاؤ مل جاتے ہیں) وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے کا دکھاوا نہیں کرتی، صرف ضرورت پوری کرتی ہے۔ لیکن جس پریم سے ڈرائیور اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، جیسے اسے استعمال کرتا ہے خود بخود ایک ستھرا اور اطمینان بخش ماحول پیدا ہو جاتا ہے، جس پر نئے سے نئے ماڈل کی گرانڈیل شیورلے کا مالک بھی رشک کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر کے پاؤں میں سادہ دیہاتیوں والا کھسہ ہے، کورے سے رنگ کی پاپلین کی پتلون، خاکی ٹویل کا کوٹ، سادہ سی ٹائی۔ مطلب یہ کہ لباس میں سادگی کا اور نہ ہی امارت کا کوئی خصوصی اظہار ہے۔

"میں کوئی کٹر مذہبی آدمی نہیں ہوں۔" نذیر کہنے لگا "قرآن شریف کو قطعی مقدر تسلیم کرتا ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کا احترام نہیں کرتا۔ اللہ، بھگوان یا گاڈ کو علیحدہ علیحدہ مذاہب کے لوگ بے شک الگ الگ انداز میں پوجتے ہوں لیکن اس کی اپنی ذات کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ ہے تو واحد ہے ---- تین چار خدا نہیں ہو سکتے۔ پھر، میں ایک سائنس داں ہوں۔ کئی مرتبہ سائنس ایسے نتائج تک پہنچاتی ہے جن کے مطابق کائنات کو خدا کی ضرورت ہی نہیں لگتی۔ قدرت بذات خود

سب طاقتوں کی مالک نظر آنے لگتی ہے' خود ہی قانون بنانے اور خود ہی ان پر عمل کرنے والی۔ اس اعتبار سے خدا کو ماننا کیا پتہ غلط ہی ہو' لیکن جب یہ شک میرے دل میں اٹھتا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں' اگر یہ دنیا رب نے نہیں بنائی' اپنے آپ ہی بن گئی ہے' تو پھر یہ میری خواہشات' میرے ارادوں اور خواہشات کے اس قدر موافق کیوں ہے؟ قدرت کو کیا ضرورت تھی میری پسند کا خیال رکھنے کی؟"

یہ نکتہ نظر روحانی تھا یا علمی' میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اس میں شاعرانہ خوبصورتی ضرور تھی اور انداز حیات میں نذیر شاید اسی خوبصورتی سے بھرپور ہے۔ وہ انسانوں' اقوام اور ممالک کی منفی خصوصیات پر دھیان دینے کی بجائے مثبت خصوصیات اور فخرمندیوں کا متلاشی ہے۔ وہ علیحدگیوں اور تنگ خیالیوں کی دیواریں توڑنا چاہتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ میرے ساتھ حکومتی یا سماجی موضوعات پر بحث نہیں چھیڑتا۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ پاکستان میں میرا وقت اچھا گزرے' میں پھر بھی آؤں۔ عوام ہر جگہ ایسے ہی ہیں' اس کی اچھائیاں برائیاں ایک جیسی ہیں' مخالفت کا کوئی فائدہ نہیں۔ دونوں دیسوں کے مابین پھر دوستی ہونے' جھگڑے مٹنے' دل کی گہری' اندرونی اور انمٹ تمنا اس کی باتوں اور اسکی خاموشیوں میں بھی متواتر چھلکتی ہے۔

میرے دل میں خیال ابھرا--- "ہندوستان ہزاروں برس سے فلسفے کا گھر رہا ہے۔ انسان کیا ہے؟ فطرت اور پرماتما کیا ہے؟ ان سوالات کے جواب ڈھونڈنا نہ صرف ہمارے دیس کے عالموں کا بلکہ عوام کا بھی ہمیشہ سے شغل رہا ہے۔ یورپین تنقید نگاروں نے ہماری اس عادت کی کافی ہنسی اڑائی ہے' اسے ہمارا جمود' جہالت اور مفلسی کا باعث بتایا ہے--- کہ یہ لوگ کیسے ترقی کر سکتے ہیں' ان کو تو اس دنیا سے زیادہ اگلی دنیا عزیز ہے۔

"یقیناً ان کی تنقید کھوکھلی اور ناجائز ہے' لیکن کیا ہمارے دیس کے اپنے پڑھے لکھے دانشور طبقے کا نظریہ ان یورپین جیسا ہی نہیں؟ کیا ہم بھی ترقی اور بہتری کے سوالات پر غور کرتے وقت دھرم اور فلسفے کو شرمندہ ہو کر بالائے طاق نہیں رکھ دیتے؟ کیا مزدوروں کسانوں کے بارے میں ہماری سوچ بچار محض ان کے علمی مسائل تک ہی محدود نہیں رہ جاتی؟ ظلم کی تکالیف کو وہ لوگ جس حد تک صبر سے سہہ جاتے ہیں ہم ان کو جاہل اور اندھے معتقد کہتے ہیں۔ ہماری نظر میں تمام پرانی دھرم کتابیں' سب نظریات و عقائد' سب اولیاء' مہاتما اور سنت ترقی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اپنے وقتوں کے ان بزرگوں نے جو کچھ کیا لوگوں کی فلاح و بہبود کو سامنے رکھ کر کیا' اور بے خوفی کے ساتھ اپنی

راہ پہ چل کر سانسوں تک کو بھینٹ کر دیا۔ اپنی اس جہالت کی عدم تشخیص کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے لئے دل میں سچی خیر خواہی رکھتے ہوئے بھی ہم ان کے دلوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارے دیس کے انسان کی روحانی بھوک اتنی ہی شدید ہے جتنی کہ جسمانی۔ یہ اس کی پسماندگی کا ثبوت نہیں' بلکہ اس کی ممتاز تہذیبی سطح کی گواہی ہے۔ ہم نے اپنی انتہائی قدیم ادوار سے چلی آ رہی روایت کے انمول ورثے' جو عوام کے گوشت پوست میں رچی بسی ہے' مغرور ہو کر' اسے بے گن اور ناکارہ سمجھ کر' ایسی جگہ پر پھینک دیا ہے جہاں خود غرض شرارتی لٹیرے اسے آسانی سے آلودہ کرتے ہیں' اسے اپنے ناپاک ارادوں کے لئے استعمال کر سکتے ہیں' ترقی کے لئے نہایت مدد گار چیزوں کو برباد کر سکتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کی تربیت ترقی پسندوں کا ساتھ دینے کی خواہش مند ہے' لیکن ان کی جانب سے دھتکاری ہوئی وہ پاکھنڈوں اور عیار شکاریوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ نتیجتاً عوام کے ذہن تو ترقی پسندوں کی جانب زور لگاتے ہیں' لیکن ان کے دل رجعت پسندوں کے محکوم رہ جاتے ہیں۔ بھلا وہ رشتے کیسے مضبوط ہو سکتے ہیں جن کا دل سے کوئی تعلق نہ ہو؟

"پھر وہی غلطی؟ پھر میں نے ہندوستان اور پاکستان کو ایک ہی دیس کے روپ میں دیکھنے لگا؟ لیکن اس تقسیم کو بھی تو صرف دماغ تسلیم کرتا ہے' دل نہیں! جس تقسیم کو دل تقسیم کرتا ہے' وہ کتنی مضبوط ہے؟ مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی تو سندھ سے راوی تک کے خطے کی کوئی تاریخ تھی۔ یہی خطہ ہی تو کبھی "آریہ ورت" کہلاتا تھا۔ لفظ "ہندو" بھی تو دریائے سندھ کے کنارے آباد لوگوں کے لئے ہی استعمال کیا گیا تھا؟ موہنجوداڑو' ہڑپہ اور ٹیکسلا کے کھنڈرات بھی تو یہیں کی قدیم تہذیبوں کے گواہ ہیں۔ کیا معاصر مسلمان باشندوں کا اس ورثے سے تعلق ٹوٹ گیا ہے؟ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ یہ ورثہ ان کی بولی' بود و باش' لباس' سنگیت' سب چیزوں میں ہی تو رچا بسا ہوا ہے۔ مثلاً مجھے اپنے آباؤ اجداد کی صرف تیسری یا چوتھی پشت تک کے نام یاد ہیں۔ لیکن ان سے پہلے کے آباؤ اجداد کی اور بھی تو بے شمار پشتیں ہو گزری ہیں۔ ان کے نام معلوم نہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرا اور ان کا خونی رشتہ نہیں! نجانے ان لوگوں کے خیالات کیا تھے' میرے خیالات سے کتنے مختلف تھے' نجانے ان میں سے کون ہندو تھے اور کون ایران سے آئے ہوئے' کون یونان سے اور نجانے کون عرب سے' پتہ نہیں کون یہاں سے نکل کر کہیں اور چلے گئے؟"......

لائلپور سے چار میل ادھر گاڑی کا پچھلا پہیہ بیٹھ گیا۔ سڑک کی ایک جانب "کوہ نور"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مل کا پھاٹک تھا۔ نذیر نے بتایا کہ اب لائلپور میں بیس سے زیادہ کپڑا ملیں بن گئی ہیں، جو نہ صرف پاکستان کی ضرورت پوری کرتی ہیں بلکہ بہت سا کپڑا بیرون ملک بر آمد بھی کرتی ہیں۔ "کوہ نور" ان میں سب سے بڑی مل ہے، جس میں لگ بھگ دس ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس مل کی، اتنی ہی بڑی، دوسری شاخ راولپنڈی میں بنائی گئی ہے۔ یہ نجی کارخانے ہیں، سرکاری نہیں۔

سڑک کی دوسری جانب ایک کالج تھا۔ پیسہ ٹھیک ہونے تک ڈاکٹر نذیر مجھے کالج کے اندر لے گیا۔ پرنسپل صاحب نے ہمیں بڑی عزت سے کافی پلائی اور دوران گفتگو معلوم ہوا کہ وہ میرے پیارے دوست مشہور لکھاری اور فلمساز خواجہ احمد عباس کے ساتھ علی گڑھ میں اکٹھے پڑھے تھے۔ عباس کے بارے میں انہوں نے بڑے شوق سے پوچھ گچھ کی اور وعدہ لیا کہ بمبئی واپس پہنچ کر عباس کو ان کا پیغام محبت ضرور دوں گا۔

پھر، اس سے تھوڑی دیر بعد بسوں کے اڈے پر مجھے اتار کر ڈاکٹر نذیر ایگریکلچرل کالج کے لڑکوں کا امتحان لینے روانہ ہو گیا۔ آگے میں جانوں اور میرا کام۔

اڈے پر بسوں کی بھیڑ لگی تھی۔ کوئی کہیں جانے والی اور کوئی کہیں۔ ان میں سرکاری ٹرانسپورٹ کی بسیں بھی تھیں اور پرائیویٹ بھی۔ ہندوستان کی طرح یہاں بھی بسیں آمدورفت کا بنیادی ذریعہ بن گئی ہیں۔ اس شور شرابے میں بے دھڑک گھل مل جانے کا ایسا لطف نصیب ہوا جو فلمی آدمی کو ہندوستان میں نصیب نہیں ہو سکتا۔

جھنگ والی بس کوئی پندرہ منٹ بعد روانہ ہو گئی۔ اس کا ڈرائیور بڑی رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ اسے دیکھتے ساتھ ہی میں نے پہچان لیا کہ پشاور یا کوہاٹ کے علاقے کا گھبرو ہے اور اسے بھی میرے پنڈی پن کا فوراً" احساس ہوتا محسوس ہوا۔ شہر سے باہر نکل کر ایک جگہ سواری چڑھانے کے لئے بس روکی۔ اسی لمحے میری نظر "مٹھے" بیچنے والے کی چھابڑی پہ پڑی اور میں اتر کر خریدنے کو للچایا اور ڈرائیور سے اجازت مانگی۔ اس نے جواب میں ہونٹوں کو پیار سے پچکار کر آنکھیں بند کر کے اور سرہلاتے ہوئے یوں "ہاں" کا اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو، "تو ہم وطن، تو چاہے جان مانگ لے۔"

وہ مجھے دکھا دکھا کر باقی سواریوں اور کلینر کے ساتھ درشتی سے بولتا، جیسے جتلا رہا ہو کہ "پردیس" میں کتنا غیر مطمئن ہے۔ کبھی کبھی وہ مڑ کر اپنی بڑی بڑی اور حسین آنکھوں سے یوں میرے ساتھ نظریں ملاتا جیسے جہلم پار کے پہاڑی مناظر کی یاد دلا رہا ہو اور میں دل میں کہتا "بے چارے ہم وطن، تو تو دیس سے دو سو میل دور بھی نہیں، تو اس کا دکھ کیا جانے جو

دو ہزار میل کی دوری پر پڑا ہے اور واپس آنے کا نام نہیں لے سکتا؟" پھر میں نے جذبات کو قابو کیا۔ اگر کہیں اسے پتہ چل گیا کہ میں ہندو ہوں اور ہندوستان سے آیا ہوں، تو کیا اس تیغ جانکاری کی آتش اس کے دل کے سوتوں کو پل بھر میں خشک نہیں کر دے گی؟

سڑک زیادہ چوڑی نہیں، لیکن بڑی اچھی اور ہموار ہے۔ ٹرکوں کی آمدورفت کی عدم موجودگی کی جانب دھیان ضرور جاتا ہے۔ ہندوستان میں عموماً" ہر شاہراہ پر ٹرک ہر وقت چلتے ہیں۔ لائلپور میں اتنی ملیں بن جانے کے باوجود لاہور سے لائلپور، لائلپور سے جھنگ جاتے ہوئے سارا راستہ شاذ و نادر ہی کوئی مال بردار ٹرک دیکھنے میں آیا ہو گا۔ ہاں، البتہ مسافر بسوں کی ضرور بھرمار تھی۔ سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے سروٹ (ایک پودا)، دور تک پھیلے ہرے بھرے کھیت عجیب بہار دکھا رہے تھے۔

کبھی کبھار کوئی بلوچی پٹھان اپنی ڈاچی کی رسی ہاتھ میں لئے چلا آتا دکھائی دیتا تھا۔ پیچھے بیٹھے دو مسافروں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ہر موسم سرما میں ہزاروں کی تعداد میں پٹھان ادھر آیا کرتے تھے، لیکن اس سال افغانستان سے کھٹ پٹ کے باعث بہت کم پٹھان آئے اور افغانستان کا انگور بھی اس دفعہ ہندوستان جا رہا ہے۔

مسافروں میں اکثریت کسانوں کی تھی، جو ہر سٹاپ پر اترتے چڑھتے۔ دھیرے دھیرے جھنگ کی سریلی بولی سنائی دینے لگی۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ایک جٹ آ بیٹھا۔ دھوپوں سے سینکی ہوئی رنگت، پرپیچ بانکی مونچھیں، کلیجی رنگ کا پٹکا، جس کے نیچے سے چکنائی زدہ اور چپکے ہوئے پٹے جھانکتے تھے۔ اس کے ساتھ کوئی بارہ برس کا پیٹ سے ننگا لڑکا، جسے دیکھ کر کرشن کنہیا کی مورتیاں یاد آتی تھیں۔ اس کے سر پر بڑا بانکا سا کپڑے کا ٹکڑا اور کمر پہ چادر۔ سیٹ پہ یوں تن کر بیٹھا، جیسے دور سے دیکھنے پر کھڑا نظر آئے۔ کلینر نے جٹ سے زیادہ پیسے مانگ لئے، یا جٹ کو غلطی لگی، ان کی آپس میں خاصی تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ کلینر پیچھے دروازے کے پاس والی سیٹ پر اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں لاہوریئے تھے۔ جھنگ کا لہجہ بنا کر وہ جٹ کی ٹانگ کھینچنے لگے۔ بولے، "بھرا" توں وی اسلمائیں، تے اسیں وی اسلمائیں۔ ودھ پیسے گھن کے اسیں چور بنتا اے؟" (بھائی تو بھی یہیں اور ہم بھی یہیں۔ زیادہ پیسے وصول کر کے ہم نے کوئی چور بننا ہے؟)

جھلایا ہوا جٹ، جس کے لئے دو چار آنے کا فرق کوئی معمولی بات نہ تھی، پل پل میری جانب دیکھتا، مجھے ثالث بنانے کی کوشش کرتا۔ "لو دیکھو باؤ جی، میرے نال ٹھٹھا پئے کریندے نیں۔"

آخر کار ڈرائیور نے دونوں فریقین کو ڈانٹ کر چپ کروا دیا۔

اس سٹاپ پر میں نے کیمرے کو ہوا لگوانے کی کوشش کی' لیکن ڈرتے ڈرتے۔ کوئی بڑا ہی سوہنا اور بانکا چودھری، چارپائی پہ بیٹھا تھا۔ چلاتی ہوئی سریلی آواز سے اردگرد جمع آدمیوں کو مسحور کر رہا تھا۔ اس کا لباس لگ بھگ وہی تھا جو میں بچپن میں اپنے نانا جی کا دیکھا کرتا تھا۔ اونچے شملے والی قلے کے بغیر پگ' سفید قمیض' واسکٹ' کمر پہ چادر اور سب سے شاندار چیز کندھے پر ڈالا ہوا ایک جیسا ہی سفید اور کڑک دار کپڑا۔ اب مجھے ساندل بار پہنچ جانے میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن تصویر کھینچنے کی فرمائش کیسے کروں؟ بتا دینا ہی ٹھیک ہو گا کہ میں کون ہوں۔ کیا معلوم ان لوگوں پر کیا اثر پڑے؟ بگڑ گئے تو یہاں میرا حال پوچھنے والا کون ہے؟ لیکن اگر انہیں مجھ پر شک ہو گیا تو کیا بنے گا؟ اگلے دس بارہ دن تو اب تنہا ہی گزارنے ہیں۔ کب تک خود کو چھپا سکوں گا۔ آخر ہمت کر کے میں نے بانکے بزرگ کے آگے کچھ اس انداز میں اپنی عرض پیش کی:

"سلام علیکم بھائی جان۔"

"وا لیکم سلام۔"

"میں بمبئی سے آیا ہوں' بلراج ساہنی میرا نام ہے' میں ہندو ہوں۔ ضلع شاہ پور ہم ساہنیوں کا وطن ہے اور میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو آپ کی ایک فوٹو کھینچ لوں؟"

"ہاں' بیشک' بڑی خوشی نال۔"

اور وہ آدمی ہاتھ سے حقہ چھوڑ کر ایک دم اٹنشن کھڑا ہو گیا' اس کے چہرے سے یوں لگنے لگا جیسے سانس ہی سوکھ گئے ہوں۔ میں اس کے کندھے پر لٹکی پستول سے اتنا خوفزدہ نہیں ہوا تھا جتنا وہ میرے کیمرے سے سہم گیا۔ باقی لوگ خوشدلی سے میری جانب دیکھنے لگے تھے' لیکن ان کی نگاہ میں غصے یا رقابت کا ذرہ برابر بھی کوئی شائبہ نہ تھا۔ زمیں پہ بیٹھے ایک بوڑھے نے پوچھا:

"سرگودھا میں موہن لال وکیل سے بھی ملو گے؟"

اس کی بولی بالکل ہمارے بھیرے جیسی تھی (سرگودھے موہن لال وکیل ن وی ملسو)۔ میں حیرت زدہ ہو کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ہمارے ساہنی بھائی سرگودھا رہتے ہیں۔ ان کے نام مجھے یاد نہیں تھے۔ میری ماں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ کچھ ایک مسلمان بھی ہو گئے تھے اور اپنے مربعوں پر بدستور آباد ہیں۔

"جی سرگودھا میں ہمارے رشتہ دار ہیں تو سہی' لیکن میں ابھی تک سرگودھا گیا نہیں۔"

"اب تو آخر جائیں گے ہی نا۔" (ہن تے آخر جاسو ای نا)

اوپر سے چارپائی پہ بیٹھا چودھری بولا (فوٹو کھنچوا چکا تھا)۔۔۔۔ "اوئے ساہنی کوئی ایک جگہ پر تو نہیں ہوتے۔ بھیرہ' خوشاب۔۔۔۔"

"جی ہاں' میرا وطن بھیرہ ہے' میں۔۔۔۔"

بھیرے میں آبائی گھر

"بولی تو آپ کی بھیرے والی کوئی نہیں" وہ بوڑھا پھر بولا۔

"بھیرہ ہمارا پرانا باپ ولوے کا وطن ہے جی۔ میں رلوپنڈی پیدا ہوا تھا۔" (بھیرہ ساڈا پرانا پیو داوے دا وتن ایں جی۔ میں راولپنڈی جمیا آس)۔

"جمیا آس" یعنی پیدا ہوا تھا سن کر ساری مجلس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں خود حیران ہوا کہ یہ بھروچی جملہ کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ کیا کسی خوف کا احساس مجھے اپنے بیان کی سچائی ثابت کرنے پر مائل کر رہا تھا' یا ان لوگوں کی جانب سے ملنے والی ان دیکھی اپنائیت نے مجھے اچھال دیا تھا۔ ساہنیوں کے متعلق گفتگو شروع ہو گئی۔ آخر کار میں نے چارپائی پہ بیٹھے شخص سے اس کا نام پوچھا تاکہ اسے فوٹو کی کاپی بھیج سکوں:

"مہر روبے خان" اس نے پھر چلا کر بتایا' جیسے کچہری میں بیان دے رہا ہو "چیئر مانو

پنیٹن کونسل نمبر 11 (چیئرمین کونسل نمبر 11)' ڈاکخانہ ویئر بنگلا' پرا چک نمبر 159' ضلع و تحصیل جھنگ!"

ہیر کا باپ چوچک بھی تو مہر تھا نا......

جوں جوں بس جھنگ کے نزدیک پہنچتی گئی میں اردگرد کو غور سے دیکھنے لگا' کہیں ہیر سلیٹی اب بھی "عقاب کے پر" کی طرح جھولتی ہوئی' سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی نظر آ جائے اور منہ مانگی مرادیں پوری کرنے والے رب نے عکس کی مانند کھیتوں میں سے گزرتی ایک ایسی مٹیار کی جھلک دکھائی جس کا حسن بیان کرنا میری قوت سے باہر ہے۔

سانولا سا رنگ تھا اس کا۔ خاصا اونچا لمبا قد' بھرا بھرا سڈول جسم' عجب مستی بھری بے جھجک آنکھیں۔ نیلے اور چیکبر کبوتر جیسا ملبوس' ناک کا لونگ بھی بجلی کی مانند کوندا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی سوہنی لڑکی شاذ و نادر ہی کبھی دیکھی ہو گی۔ ساتھ ہی میرے من میں خیال اٹھا کہ اس علاقے کے لوگوں کا چہرہ مہرہ کچھ کچھ کاٹھیاواڑی لوگوں سے ملتا جلتا نہیں؟

مندرجہ بالا احوال ڈائری میں درج کر کے میں نے تانگے والے کو گورنمنٹ کالج چلنے کا کہا۔ ڈاکٹر نذیر نے مجھے اپنے دو دوستوں کے پتے بتائے تھے اور انہوں نے پہلے ہی فون پر میری آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ ایک انجم تقی' جو مقامی گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے اور دوسرے شیر افضل جعفری' جو کسی سرکاری محکمہ میں کام کرتے تھے۔ دونوں اردو زبان کے ممتاز اور مشہور و معروف شاعر۔

تانگے والا دہلی میرٹھ کے علاقے کا لگتا تھا۔ نجانے کس بناء پر اس نے مجھے بھی اپنے ہی علاقے کا سمجھ لیا۔ لگا جھنگ والوں کی مذمت کرنے ــــــــــ

"آپ یہاں کیا دیکھنے کے لئے تشریف لائے ہیں صاحب' یہ تو ایک دم اجڑا ہوا ویران علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ تو خود اپنے آپ کو جنگلی کہتے ہیں اور ہیں بھی صاحب واقعی بالکل جنگلی۔ بھلا خیال فرمایئے' روٹی کو یہ لوگ "ٹکر" کہتے ہیں لاحول ولا' کیا ناشائستہ زبان ہے ان کی' اور کیسے بھدے رسم و رواج ہیں۔ عورتوں کو کوئی پردہ نہیں' مردوں کے سامنے ننگی گھومنے میں بھی انہیں کوئی شرم و حیا نہیں۔ کیا کہیں صاحب' قسمت نے کہاں لا پٹکا ہے ہم بدنصیبوں کو..."

میں کیا جواب دیتا؟ چپ چاپ سوچتا رہا کہ بھئی "ٹکر" لفظ میں کیا برائی ہے جو اسے اتنا ناگوار گزرا ہے۔ انجم تقی کالج سے روانہ ہو چکے تھے۔ سٹاف روم میں بیٹھے پروفیسر میرے

نام سے بذریعہ فلمی رسائل واقف تھے۔ ایک دو نے میری فلم "ہم لوگ" دیکھ رکھی تھی۔ بڑی اچھی طرح پیش ائے۔ کہنے لگے "ہیر کے مقبرے کی زیارت کرنے آپ بمبئی سے چل کر آئے ہیں' یہ جھنگ کھیانے کے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔"

میں بہت حیران ہوا۔ انہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں ہیر کے مقبرے کی زیارت کرنے آیا ہوں؟ جواب میں ایک نے ملٹری گزٹ کا اس دن کا پرچہ میرے آگے کر دیا۔ میرے بارے میں کافی طویل بیان چھپا ہوا تھا۔ اس طرح کا کچھ "مگر مختصر" پاکستان ٹائمز میں بھی چھپا تھا۔ دونوں بڑے معترفانہ تھے۔ کہتے ہیں نا' گھر کا پیر بے وقعت ہوتا ہے۔ فلمی رسالوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی روزنامہ نے کبھی مجھے اتنی اہمیت کے قابل نہیں سمجھا' لیکن پاکستان میں جتنے دن بھی قیام کیا' ہر روز کبھی بڑے بڑے انگریزی اور اردو اخبارات میں میری سیر کے متعلق خبریں اور تصاویر چھپتی رہیں۔ کسی نے بھی کوئی جھوٹی یا مخالفانہ بات نہ لکھی۔ ہر شہر میں نامہ نگاروں نے میرے انٹرویو لئے اور چھاپے۔ جہاں بھی پہنچا' میرے شناساؤں کو میری آمد کی خبر پہلے سے مل چکی ہوتی۔ ہندوستان مخالف حکومتی خیالات اور ارادے یہاں کے اخبارات میں بھی اسی مقدار میں ہوتے جتنے ہمارے پاکستان مخالف اخبارات میں چھپتے ہیں' لیکن فن کے میدان میں مروت اور سخاوت ہی نظر آئی۔ ہر اخبار اور نامہ نگار پر اس بات کا جذباتی اثر تھا کہ میں بڑے سالوں بعد اپنی جنم بھومی کو دیکھنے آیا ہوں۔ ان کی تحریروں میں مجھے اپنائیت نظر آتی تھی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

5

بچپن میں لفظ "جھنگ مگھیانا" عموماً سنائی دیتا تھا' لیکن مجھے آج تک یہ معلوم نہ تھا کہ جھنگ اور مگھیانا دو ملحقہ علیحدہ علیحدہ شہر ہیں' اور ہیر کی قبر جھنگ میں نہیں بلکہ مگھیانا میں ہے۔

پنجاب کے دیگر شہروں کی گلیوں کی طرح ہی ایک گلی میں پروفیسر انجم تقی صاحب کا گھر تھا۔ کالج سے آکر وہ جمعہ کی نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ تشریف لائے اور ان کی ناقابل فراموش شخصیت سے میرا تعارف ہوا۔

انجم تقی مہاجر ہیں' یعنی تقسیم کے زمانے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ "شرنارتھی" لفظ کے مقابلہ میں "مہاجر" لفظ مجھے بہت اچھا لگا۔ اس میں سے بے عزتی اور بے توقیری کی بو نہیں آتی۔ انجم جی کا سابقہ وطن بدایوں ہے۔ فلموں کے مشہور گیت کار اور اردو شاعر شکیل بدایونی سکول اور کالج میں ان کے ہم جماعت تھے۔ انجم کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی' لیکن بال قبل از وقت سفید ہو چکے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں بڑا درد ہے' جیسے بن پوچھے بتا رہی ہوں کہ زندگی نے حدیں پھلانگ کر ان پر سختیاں کی ہیں۔ بڑا ہی نحیف اور سبک جسم' جیسے ہر انجانے سے کترانے کا خواہشمند ہو۔ کہنے لگے' "سامان کہاں ہے آپ کا؟"

"وہ تو ڈاکٹر نذیر صاحب جی کی ہدایت کے مطابق گیسٹ ہاؤس میں چھوڑ آیا ہوں۔"

"واہ' بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے تو فون پر کہا تھا کہ آپ میری پاس ہی رہیں گے۔"

"پہلے آپ کو ساتھ لے کر مجھے پولیس سٹیشن میں اپنے پہنچنے کی رپورٹ لکھوانی ہے۔ اس کے بعد جہاں آپ کہیں گے رات گزار لوں گا۔"

"رات گزار لوں گا' کیا مطلب' آپ ہمارے شہر میں صرف ایک دن ٹھہریں گے؟ ناممکن بات ہے' خیر' پہلے آپ کو پولیس سٹیشن کی سیر کروا لوں۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔"

میں روٹی کھا چکا تھا' لیکن پھر سے کھانا پڑی کیونکہ انہوں نے میرے لئے تیار کر رکھی تھی' بلکہ اپنے ایک پڑوسی دوست کو بھی بلایا ہوا تھا۔ انجم انہیں شیری صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ شیری صاحب جھنگ کے رہنے والے' کسی سرکاری محکمے میں اونچے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگا جیسے پہلے بھی ان کو ضرور کہیں دیکھا ہے' یا ہو سکتا ہے میرے کسی واقف کار سے ان کی شکل بہت ملتی ہو۔ وطن چھوڑ کر آنے پر انجم تقی کی شیری صاحب نے بہت مدد ہی نہیں کی تھی بلکہ انہیں اپنا لیا۔ دنیا داری کے کڑوے پن سے گھبرانے والے اور دربدر ہو چکے شاعر کو کسی دلیر' نیک دل اور عملی انسان کی ضرورت تھی' جو شیری صاحب نے پوری کی۔ نتیجتاً جھنگ انجم کو اب اپنے بدایوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ان کی اعلیٰ قابلیت کی بنیاد پر انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر کی پیشکش ہوئی تھی' لیکن انجم کو جھنگ چھوڑ کر جانا منظور نہ ہوا۔ یہاں معمولی سی تنخواہ پر کام کرتے رہنا انہیں زیادہ پسند تھا۔ بحالی آبادی محکمہ میں شہر کے کسی اور علاقے میں ایک مقام انجم کے نام الاٹ کر دیا۔ اگر وہ اس میں چلے جاتے تو مکان ان کی اپنی ملکیت بن جاتا۔ لیکن انجم نے یہ بھی منظور نہ کیا۔ شیری صاحب کے مکان کی دیوار سے دیوار ملائے کھڑے مکان میں کرائے دار بن کر ٹکے رہنا بہتر خیال کیا۔ ان کے چھ بچے ہیں اور تنخواہ تعلیم کے اخراجات کے لئے بھی پوری نہیں ہوتی۔ لیکن انجم کو یقین ہے کہ وہ شیری صاحب سے دور رہ کر جی نہیں سکتے۔

اس انوکھی دوستی میں سے مجھے صرف شیری صاحب کے کردار کی ہی نہیں' بلکہ مکمل پنجابی کردار کی خوشبو بھی آئی۔ یہاں سے جانے والے لٹے پٹے عوام نے جس عالی حوصلگی اور خود انحصاری کا ثبوت دے کر ہندوستان کو چکاچوند کیا تھا' شیری صاحب کی فیاضی بھی اسی رشک کا ایک اور پہلو تھی۔

ان خصوصیات سے علاوہ شیری صاحب شاستری سنگیت کے بھی ماہر شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن تقسیم کے زمانے کی افراتفری نے یہ فن ہمیشہ کے لئے ان سے چھین لیا ہے۔

پولیس سٹیشن کی طرف جاتے ہوئے انجم تقی نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان کے ساتھ خالص ہندی میں بات چیت کروں۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے بی۔ اے تک

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سنسکرت پڑھی تھی اور ہندی ادب کے بھی کافی شوقین تھے۔ اس باعث سنسکرت لفاظی سننے اور استعمال کرنے کو ترسے ہوئے تھے۔

پولیس اسٹیشن سے معلوم ہوا کہ پہلے سیکورٹی دفتر میں رپورٹ دینی پڑے گی' جو پولیس لائن میں ہے۔ پولیس لائن پہنچے تو پتا لگا کہ جمعہ ہونے کی وجہ سے دفتر بند ہے۔ سیکورٹی افسر شاید اپنے گھر ملیں گے۔ گھر گئے تو معلوم ہوا کہ نماز پڑھ کر ابھی واپس نہیں آئے' نہ جانے کس وقت آئیں گے؟

انجم صاحب بھی سن چکے تھے کہ میرے جھنگ آنے کی بنیادی وجہ ہیر کی قبر دیکھنا ہے۔ وہ یہاں سے بالکل نزدیک تھی۔ انہوں نے رائے دی کہ اتنی دیر میں ادھر کا چکر لگا آتے ہیں۔ میں نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

کچی اور گرد آلود سڑک پہ اٹھایا ہوا ایک ایک قدم مجھے اپنے تصور کی اس بہت پیاری چیز کے نزدیک لے جا رہا تھا۔ وارث شاہ کی ہیر دنیا کے عظیم شاہکاروں میں سے ہے' یہ حقیقت ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ میرے سامنے آئی ہے جب میں اس لازوال داستان عشق کو اٹھا کو پڑھنے لگتا ہوں۔ وارث شاہ کی زبان میں پھوٹتے چشموں جیسی نرمی اور خودروی ہے۔ وہ ہر قسم کے صنائع بدائع شاعری سے آراستہ ہونے کے باوجود بھی وہ کبھی ست اور بوجھل نہیں ہوتی:

"تازی طبع تے عشق سوار کر کے کبھی چاڑھ مدان وچ نوریا سی"

"ہھا دین کے زیب بنا دتا....."

کر کے کالیاں بگیاں کاغذاں نوں کدے شعر نوں لیک نہ لائیے جی....."

شاعری کی کوئی بھی کسوٹی لے لیں' وارث شاہ کی ہیر امتحان میں پوری اترے گی۔ اسے پڑھتے وقت انگلستان کے لازوال شاعر کیٹس کے ایک جملے کی جانب بار بار میرا دھیان جاتا ہے۔ "شاعری شاعر کے پاس یوں آنی چاہئے جیسے شاخ پر کونپلیں' ورنہ یہ بالکل ہی نہیں آنی چاہئے۔"

پاکستان جانے کا پروگرام بناتے وقت مجھے جھنگ کا خیال نہیں آیا تھا۔ لیکن روانگی سے قبل ایک دن پھر یونہی کیٹس کے مجموعہ شاعری کا اس کا اپنا تحریر کردہ دیباچہ پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس میں کیٹس بار بار ماں بولی کا لفظ دوہراتا' اس کا نام لے لے کر جھومتا ہے' جیسے زندگی میں وہی اس کی سب سے عزیز شے ہو اور اچانک مجھے خیال آیا "ضرور وارث شاہ کو بھی اپنی پنجابی ماں بولی سے اسی طرح جنون کی حد تک عشق ہو گا" یہی اس کی بلا رکاوٹ اور ان

تھک شاعرانہ پروازوں کا راز ہے۔ بھلا پنجابی زبان کا کوئی لفظ ایسا رہ گیا جو اس نے استعمال نہ کیا ہو؟ پنجابی رہن سہن اور تہذیب کا کوئی منظر ایسا ہے جو اس نے پیش نہ کیا ہو؟ انسانی دل کا کوئی تار ایسا ہے جو اس نے چھیڑا نہ ہو؟ جولیٹ جیسی موضوعی ادب کی اعلیٰ عشقیہ نظموں کی صف میں بیٹھ کر بھی ہیر کتنی پنجابی ہے:-

فجر ہوئی تے اٹھ کے ہیر جی' بیٹھ انگنے وچ اشنان کیتا
لونڈی پائی کے غماں دے وچ بیٹھی' رانجھے یار دے ول دھیان کیتا
میں تک تیری لگن ہاں رانجھیا وے' دل وچ اقرار ایمان کیتا
تیرے باجھ نہ انگ تے نین جوڑاں' شاہد حال دا رب رحمان کیتا
کتے رانجھا نظر نہ آوندا اے' لوے وقت ہی جی غلطان کیتا
لو بھے ساہ لے کے گم صم ہوئی' پنڈا وٹ کے تے سنسان کیتا
ڈبی وچ دلیل دے کھا غوطہ' سیر جا پاتل ڈونگھان کیتا
صورت ہیر دی وچ تصویر ہو کے' رجوع رب دی طرف روان کیتا
جاتا اک خدا رب حق جی' دوئی دور جیوں رو شیطان کیتا
ہوئیاں سب کدورتاں دور وچوں' دل ہیر دا نور نوران کیتا
قبر تک نہ بھلساں رانجھنا وے' میرے نال جو تدھ احسان کیتا
وارث شاہ فراق دے نال جی' باراں ماہ دا ذکر بیان کیتا.....

(فجر کے وقت ہیر جی نے آنگن میں بیٹھ کر غسل کیا۔ سر جھکائے غمزدہ بیٹھی اور رانجھے یار کی سوچیں سوچنے لگی۔ اے رانجھے میں تو تیری امانت ہوں' دل میں یہ قول و قرار کیا ہے۔ تیرے علاوہ کسی سے انگ یا نین نہیں ملائے' رب رحیم کو اپنے حال کا گواہ بنایا۔ رانجھا کہیں نظر نہیں آتا' دل سوچوں میں غلطاں ہے۔ وہ ٹھنڈی سانسیں لے کر گم صم ہوئی اور بدن کو اینٹھ کر بے حس کر لیا۔ اس نے دلیلوں کے سمندر میں غوطہ کھایا اور پاتال کی گہرائیوں کی سیر کی۔ ہیر کی تصویر بن کر رب سے مدد مانگی۔ اس خدائے واحد کو جانا اور دل سے دوئی کو شیطان کی طرح دور کیا۔ سب کدورتیں دھل گئیں اور ہیر کا دل نور افشاں ہو گیا۔ اے رانجھے تو نے جو احسان کیا ہے اسے قبر تک نہیں بھولوں گی۔ وارث شاہ' ہیر جی نے فراق اور جدائی میں کٹنے والے بارہ ماہ کو بیان کیا...... مترجم)

میں نے ان خیالوں میں مگن رانجھے اور ہیر کے دیس کی یاترا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شہر کے بیرونی حصے کی برائے نام آبادی میں سے گزر رہے تھے۔ ہمیں آتے دیکھ کر

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

دور سے ہی ایک دیو قامت آدمی اپنے مکان کے برآمدے میں سے اٹھ کر سڑک کے عین درمیان میں آ کھڑا ہوا' جیسے ہماری راہ روکنا چاہتا ہو۔ اس کا رنگ سیاہ کالا' سر پر برش کی طرح کھڑے ہوئے بال' آنکھوں پر موٹی موٹی عینکیں' سفید ململ کا لمبا کرتہ اور شلوار۔ وہ اونچی آواز میں بولا' "کیوں پروفیسر صاحب' اج اس پاسے کنج بھل کے آ گئے ہو؟"

انجم تقی نے قریب جا کر میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ کیسے پنجابی ادب اور وارث شاہ مجھے بڑی دور سے یہاں کھینچ لایا ہے۔

ابھی انجم کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس شخص نے اپنی بھاری اور گرجدار آواز میں میری جانب مخاطب ہو کر کہا' "ساہنی صاحب نے تے ایہہ بہت چنگا کیتا۔ ویکھو نا انگلینڈ دا اک بہت وڈا شاعر سی کیٹس۔ اوس نے اپنی کتاب وچ لکھیا ہے بھئی شاعر نوں اوسے زبان وچ شاعری کرنی چاہی دی ہے جہڑی اوس نوں اپنی ماں دے دودھ وچ ملی ہووے۔"

میں ہکا بکا ہو کر' بت کی مانند اسے دیکھتا رہ گیا' جیسے ہوش و حواس گم ہو گئے ہوں۔ اس نے اپنے انتہائی لمبے قد کی اونچائی سے نیچے میری جانب گھورتے ہوئے کہا' "اینا حیران کیوں پے ہوندے او' میں کائی (کوئی) غلط گل کہی اے؟"

میں نے جواب دیا "تمہیں کیا بتاؤں۔ دور کھڑے ہوئے تم مجھے کوئی غیبی ہستی لگے تھے۔ لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ تم سچ مچ غیبی ہستی ہو۔"

یہ سن کر وہ بھی کافی حیران ہوا کہ اس کے منہ سے نکلے کیٹس کے ان الفاظ نے ہی مجھے جھنگ جانے پر مجبور کیا تھا۔ مافوق الفطرت باتوں پر یقین نہ ہوتے ہوئے بھی یہ سطریں لکھتے وقت مجھے پھر شک ہو رہا ہے کہ ضرور ہماری اس ملاقات میں کوئی غیبی ہاتھ کار فرما تھا۔

اب وہ آدمی بھی چپ چاپ ہمارے ساتھ چل دیا اور اس کے بعد سارا وقت خاموش ہی رہا۔ مقبرہ دیکھ کر واپس آنے کے بعد جیسے ملے تھے ویسے ہی بچھڑ بھی گئے۔ اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہوئی۔ وہ شہر کا ایک ممتاز وکیل تھا۔

ہیر کے مقبرے میں کوئی خاص بات نہیں۔ چھوٹے سے ٹیلے پر یہ یادگار بنی ہوئی ہے۔ اس کے چار مینار ہیں' جنہیں دیکھ کر گنبد کی عدم موجودگی ادھورے پن کا احساس دلاتی ہے۔ اندر داخل ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ گنبد بنانے کا آغاز کیا گیا تھا' لیکن شاید ہیر کی زندگی کے ادھورے پن کو ذہن میں رکھ کر اسے بھی بیچ میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب قبر کے پاس کھڑے ہو کر اوپر دیکھیں تو ادھورے گنبد کے دائرے میں سے آسمان دکھائی دیتا ہے۔

کہتے ہیں بارش میں قبر پر پانی نہیں گرتا۔ یہ بات تسلیم کرنا تو مشکل ہے' لیکن یقین سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ رات کے وقت ہیر کی قبر پر ستاروں کی روشنی لازماً پڑتی ہو گی۔

قبر کے سرہانے پر اردو میں ایک لوح پہ لکھا ہے کہ یہ ہیر اور رانجھے دونوں کی مشترکہ قبر ہے۔ وہ ساری عبارت اس قدر جذباتی ہے کہ اسے پڑھ کر سارے مقبرے کی اصلیت پر شک سا ہونے لگتا ہے' اور وہ ایک کھیل لگنے لگتی ہے۔

اردگرد کی دیواریں پنسلوں سے بنائی تصاویر اور عبارتوں سے کالی ہوئی پڑی ہیں۔ مزار دیکھنے کے لئے آنے والوں میں سے متعدد لوگوں نے اپنے دلوں کے دکھڑے اور پتہ نہیں کیا کیا لکھ مارا ہے۔ ہیر نے قاضی کے سامنے عشق کو' جس کا رب گواہ تھا' دنیا کی نظروں میں قابل احترام اور بارسوخ بنانے کی خاطر غضب کے حیلے کئے تھے' لیکن اس کی ہڈیوں کے ساتھ روا بے تکلفی کو دیکھ کر بندہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ مرنے کے چار سو سال بعد بھی اپنے مافی الضمیر میں کامیاب نہیں ہوئی۔ مثلاً (ایک من چلے نوجوان نے لکھا ہوا ہے):

"اگر کوئی ٹیڈی گرل رستم پاکستان بھولو پہلوان سے شادی کرنا منظور
کرے تو میں مائی ہیر کے مزار پر ایک سو نفل پڑھاؤں گا۔"

ہیر کے مقبرے سے واپس آ کر انجم تقی اور میں پھر سکیورٹی کے پولیس انسپکٹر چودھری صاحب کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔

ویسے اس قدر جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ قانون کے مطابق غیر ملکیوں کو نئی جگہ پر پہنچ کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پولیس سٹیشن پہ حاضری دینا ہوتی ہے۔ آج جمعہ کی چھٹی تھی' اس لئے یہ کام کل پہ ڈالا جا سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے مجھے ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ لاہور میں ڈاکٹر نذیر کے نجی سیکرٹری نے ساری بھاگ دوڑ اپنے ذمے لے رکھی تھی' کبھی مجھ سے پاسپورٹ لے جاتا تھا اور کبھی واپس کر دیتا۔ روانگی کے وقت میرے ہاتھ میں اک لمبا سا کورا کاغذ پکڑا دیا اور سرکاری طور پر کہا تھا' "جھنگ پہنچ کر پاسپورٹ اور یہ کاغذ پولیس سٹیشن میں دکھا دینا۔" مزید کچھ انہوں نے بتایا' نہ ہی میں نے پوچھا۔ اس لاعلمی کی اتنی بڑی سزا بھگتنی پڑے گی' اس بات کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

پہلے ہم دوبارہ چودھری صاحب کے گھر گئے۔ وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ پھر پولیس لائن۔ وہاں بھی کسی کو اتا پتہ نہیں تھا۔ اب انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' اس لئے باغیچے میں لیفٹ رائٹ کرنے لگے۔ انجم تقی بھی اتنے ہی ناتجربہ کار تھے جتنا میں۔

شام گہری ہو چلی تو آخر کار انسپکٹر صاحب دور سے آتے نظر آئے۔ اس وقت ہم پھر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ٹہلتے ٹہلتے ان کے گھر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ نجانے کسی "اڑتی چڑیا" نے انہیں پہلے ہی ہماری خبر دی تھی' دور سے ہی آواز بلند کر کے بولے' "مسٹر ساہنی! ہمیں آپ کے آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔"

اپنی طرف سے تو انہوں نے مزاجاً" کہا ہو گا' لیکن ہمیں یوں لگا جیسے انہوں نے کسی مفرور ملزم کو خبردار کیا ہو۔ پہلے وہ ڈیوڑھی (دالان) میں سے' جہاں ان کا ضعیف باپ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا' دو خستہ حال سی فولڈنگ آرام کرسیاں نکال لائے اور ہاتھ سے جھاڑ پونچھ کر ہمارے لئے بچھا دیں۔ اس مروت بھرے سلوک نے ہمیں بڑا متاثر کیا۔ پھر ایک اور کرسی لا کر خود بھی بیٹھ گئے۔ میں نے سوچا' ہمارا کام جلدی جلدی ہو جائے گا۔

بڑے ادب سے میں نے اپنا پاسپورٹ اور کورا کاغذ' جس کی اہمیت دن بدن پاسپورٹ سے بڑھتی لگتی تھی' ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ انہیں کافی دیر تک غور سے دیکھتے رہے اور پھر دور سے گزرتے ہوئے ایک سپاہی کو آواز دے کر حکم دیا کہ دفتری کے کوارٹر میں جا کر اسے پاسپورٹ والا رجسٹر جلدی لانے کو کہے۔

دفتری کے آنے تک وہ پھر نہایت خوش خلقی سے بات چیت کرتے رہے۔ چائے پانی پوچھا' سگریٹ پیش کیا۔ ہم ان کی انکساری اور شرافت کے پوری طرح قائل ہوتے جا رہے تھے۔

رجسٹر' قلم' دوات وغیرہ لے کر دفتری بھی آ گیا۔ اس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور سر پہ نیلے بلیرز کی گول (بیرے) ٹوپی' جو بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ رجسٹر کو گھٹنوں پہ رکھ کر چودھری صاحب پاسپورٹ کے ورق پھر الٹنے لگے۔

پاسپورٹ ہاتھ میں پکڑنے' کھولنے اور ورق الٹنے کا انداز' میں نے دیکھا ہے' ہر ملک میں پولیس والوں کا ہو بہو ایک جیسا ہوتا ہے۔ نجانے اس میں کیا راز ہے؟ اس وقت پولیس افسر کے چہرے پر عجیب طرح کی بے تاثری آ جاتی ہے' جیسے موقع کی نزاکت کے احترام میں اس نے اپنے شخصی جذبات کو دل کی کسی علیحدہ الماری میں بند کر دیا ہو۔

پاسپورٹ کا معائنہ کر چکنے کے بعد انہوں نے ایک لمبا سانس بھرا اور قلم دفتری کے ہاتھ میں پکڑی دوات میں ڈبوئی۔ مرادیں بر آنے کے پرمسرت لمحے کی آمد کی خوشی میں انجم تقی اور میں کرسیوں پہ ذرا اونچے ہو کر بیٹھ گئے۔ قلم کی نب دوات میں سے نکل کر رجسٹر کے عین پہلے خانے پر منڈلانے لگی' لیکن اسے کاغذ کے ساتھ ملاتے ملاتے' جیسے ہمارا اشتیاق اور بڑھانا چاہتے ہوں' وہ اچانک رک گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے وطن سے کوچ کرنے سے پہلے

کے جیون کی کوئی بھولی بسری بات' جس سے میں جان پہچان رکھتا تھا' آج پھر اجاگر ہو کر سامنے آ گئی۔ کنوئیں کے ڈول کی مانند میرا دل نیچے اترنے لگا۔

آخر کار' کچھ کہے بغیر' انہوں نے رجسٹر بند کر کے دفتری کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے "چلیں دفتر چلتے ہیں۔"

ہم ان کے پیچھے چلتے چلتے ایک مرتبہ پھر پولیس لائن جا پہنچے۔

دفتر کی کرسی پہ بیٹھتے ہی ان کا افسرانہ انداز خوب نکھر آیا۔ میز پہ کہنیاں ٹکا کر اور اس کے نیچے ٹانگیں ہلا ہلا کر انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کی۔ "آپ کون ہیں؟ پاکستان کیوں ائے؟ کتنے عرصہ کے لئے؟ ویزہ کیسے ملا؟ کس نے آنے کی دعوت دی؟ کہاں کہاں جا چکے ہیں؟ لاہور میں کہاں کہاں گئے تھے؟ کس کے پاس ٹھہرے تھے؟ وہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟ کب سے انہیں جانتے ہیں؟ جھنگ آپ کو کس نے بلایا ہے؟ کس مقصد کے تحت آئے ہیں؟ کتنے دن ٹھہریں گے؟ پھر کہاں جائیں گے؟ وہاں کس سے ملیں گے؟"

پھر' جیسے میری دی ہوئی معلومات سے تسلی نہ ہو رہی ہو' انہوں نے انجم تقی سے رجوع کیا' جو بیچارہ ہر لحظ خوفزدہ ہوتا جا رہا تھا۔ "آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"
سوال کرتے وقت انہوں نے میری جانب یوں اشارہ کیا جیسے "قاتل' خونی' اچکا' بدمعاش" وغیرہ جیسی تمام اوصاف مجھ میں موجود ہیں۔

"جان پہچان تو آج ہی ہوئی ہے صاحب' ویسے ان کے بارے میں سنا بہت تھا۔ ہندوستان کے ایک مشہور فلم ایکٹر ہیں' بہت اچھے آدمی ہیں اور پھر میرے مہربان افسر اور دوست ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے مہمان ہیں....."

"مگر یہاں کھیانا میں تو آپ کے مہمان ہیں نا؟" افسر نے ٹوک کر خالص پنجابی جھنگی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا' "میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ شہر کی حدود کے باہر ان کو ہیر کا مقبرہ دکھانے کے لئے کیسے لے گئے؟"

تقی چپ۔ اس کی بجائے میں نے جواب دینے کی کوشش کی۔

"دیکھئے ہیر کا مقبرہ دیکھنے کی غرض سے ہی تو میں یہاں آیا ہوں۔"

چودھری صاحب کی پہلے سے سرخ آنکھیں مزید سرخ ہو گئیں۔ کہنے لگے' "جناب قاعدے سے آپ دیکھ سکتے ہیں' بے قاعدہ آپ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ پہلے تو آپ کا ویزہ ہی جھنگ کا ہے' کھیانا کا اس میں ذکر نہیں ہے۔ ہماری اجازت کے بغیر آپ کھیانے کے اندر بھی نہیں گھوم سکتے' پھر باہر کیسے گھوم سکتے ہیں؟"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دل چاہا میں بھی پوچھوں کہ اگر میرے لئے سو قدم شہر کی حد سے باہر جانا غیر قانونی تھا' تو پھر سارا دن اس کے دفتر میں کسی باعلم شخص کا نہ ہونا کس اعتبار سے قانونی ہے؟ لیکن میں سنبھل گیا۔ میں پرائے ملک میں تھا۔ میری سرزد کردہ کوئی بھی غلطی میرے ملک کو بے عزت کر سکتی تھی۔ یہ افسر میرے ساتھ ناجائز سلوک کر رہا تھا' لیکن اس وقت چپ چاپ برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"آپ ٹھہرے ہوئے کہاں ہیں؟" اس نے پھر خفگی بھرے انداز میں پوچھا۔

"فی الحال میرا سامان گیسٹ ہاؤس میں پڑا ہے" میں نے جواب دیا۔ مجھے امید ہوئی کہ تقی انجم دھڑلے سے مجھے اپنا مہمان قبول کریں گے' کیونکہ وہ مجھے اپنے گھر ٹھہرانے پر کافی اصرار کر چکے تھے۔ لیکن وہ خوف کے مارے کچھ نہ بولے۔ اب میں نے خود کو مکمل طور پر بے سہارا محسوس کیا۔

"گیسٹ ہاؤس آپ کے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے افسروں کے ٹھہرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ آپ وہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"آپ جہاں فرمائیں گے میں وہیں ٹھہر جاؤں گا۔"

"آپ ان کو زیل گھر میں لے جایئے۔" اس نے تقی انجم سے کہا' "بہت اچھی سرائے افسروں کے لئے بنی ہوئی ہے۔"

گیسٹ ہاؤس سے بے تعلق ہو کر سرائے میں دھکے کھانے کی بے عزتی بھی کم نہیں تھی' لیکن اس سے زیادہ مجھے لفظ "سرائے" سنتے ساتھ ہی تصور میں اجاگر ہونے والی تصویریں خوفزدہ کرنے لگیں۔ میں آج تک کبھی کسی سرائے میں رہا تھا اور نہ ہی کبھی کوئی سرائے دیکھی تھی۔ لیکن اگر یہ بے درد انسپکٹر مجھے وہاں بھیج رہا ہے تو وہ ضرور کوئی گندی اور تکلیف دہ جگہ ہو گی۔ نجانے کیسے لوگ ہوں گے وہاں؟ نجانے وہ ایک تن تنہا "ہندو" سے کیسا سلوک کریں گے؟

مجھے انسپکٹر کے دشمنانہ رویے کا اس سے علاوہ کوئی سبب نظر نہ آیا کہ وہ مجھے اپنی مٹھی گرمانے پر مجبور کر رہا ہو گا۔ لیکن یہ..... بات بھی کسی حیلے بہانے سے مجھے منظور نہیں تھی۔

ایک راہ مجھے اور نظر آئی' وہ یہ کہ آج کے "پاکستان ٹائمز" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" (جن میں میری پاکستان آمد کے متعلق عزت افزاء تحریریں چھپی تھیں) کا حوالہ دے کر اپنے ایک اہم اور غیر معمولی شخصیت ہونے کا اعلان کر دوں۔ لیکن یہ بھی مجھے اوچھا سا

کام لگا۔ بدھ بھگوان کی مورتی کی طرح مسرت آگیں سچائی کی مورت بن کر بیٹھے رہنا ٹھیک محسوس ہوا۔

انجام کار' کسی مزید کارروائی کی گنجائش نہ بنتے دیکھ کر انسپکٹر صاحب نے رجسٹر میں اندراج کر ہی لیا' لیکن رخصت ہوتے وقت اپنی تلخی کو عیاں کرنے کے لئے وہ ایک آخری تیر چھوڑنے کے لالچ کو روک نہ سکا' "کیمرہ اس طرح کندھے پر ڈال کر آپ نہیں گھوم سکتے۔"

"کیوں؟ فوٹو لینے کی ممانعت ہے کیا؟"

"آپ اپنے دوستوں کے فوٹو لے سکتے ہیں' لیکن کیمرے کو کندھے پر اٹھا کر نہیں گھوم سکتے۔ اس کو آپ سوٹ کیس کے اندر رکھئے' صرف ضرورت کے وقت نکالئے۔"

"لیکن لاہور میں تو مجھے کسی نے نہیں روکا؟"

"نہ روکا ہو گا' وہ دوسری بات ہے' لیکن میں جو قانون ہے وہ آپ کو بتا رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے' میرا کسی بھی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

پولیس لائن میں سے نکل کر ابھی کوتوالی جانا تھا۔ اوپر سے تو میں نے "خوش مزاج" رہنے کی کوشش کی' لیکن اندر سے خوف اور غصے کے مارے میرا برا حال تھا۔ بھاڑ میں جائے وہ سیر' چاہے وہ اپنی مادر وطن ہی کیوں نہ ہو' جس کی خاطر اپنی غیرت اور عزت قربان کرنی پڑے۔ کیا معلوم کوتوالی میں کیسا استقبال ہو! کیا پتہ اگلے موڑ پر تقی انجم بھی سلام و علیکم کہہ کر اپنی راہ لے؟ اس میں اس کا بھی کیا قصور ہے؟ اسے بیٹھے بٹھائے خوامخواہ کی مصیبت پلے پڑ گئی۔ سوچتا ہو گا' "پتہ نہیں یہ کون خطرناک آدمی ہے؟ پتہ نہیں اس کی وجہ سے پولیس کو مجھ پر بھی کوئی شک ہو جائے! کل کو یہ تو چلا جائے گا' پیچھے میرا کیا بنے گا؟"

لیکن انجم کے منہ سے انسانیت بھرا ایک ایسا جملہ نکلا جس نے میری آنکھوں کو اپنائیت کے سرور سے تر کر دیا' "ساہنی صاحب میں بہت ہی شرمسار ہوں۔ ان لوگوں کو کسی بات کا خیال ہی نہیں۔ بھلا آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے!"

کتنی سادگی اور نرمی تھی ان الفاظ میں۔ اپنی شرمندگی پر پردہ ڈالنے کا' بناوٹی ہمدردی دکھانے کا' شائبہ تک نہیں تھا اور نہ ہی مجھ سے دامن چھڑانے کی کوئی عجلت تھی۔ میں نے پیار سے انجم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا' "اس میں آپ کیا کر سکتے تھے اور میں بھی کیا کر سکتا ہوں؟ یہ تو قاعدہ قانون ہے۔ ممکن ہے جو کچھ آج میرے ساتھ گزری ہے پاکستانی مسافروں کے ساتھ ہندوستان میں بھی وہی گزرتی ہو۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کوتوالی کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب حوالات کی ایک کوٹھڑی دیکھی۔ اس کی دیوار میں دو سلاخیں جڑی بڑی بڑی محرابیں تھیں، جن کی وجہ سے پہلی نظر میں یہ چڑیا گھر کا پنجرہ معلوم ہوتی تھی۔ صحن کی طرف بھی محراب کے عین بیچ میں، سلاخوں کو پکڑ کر ایک ایک جوان کھڑا تھا، جس کے جتوں والے پٹے اور شرعی داڑھی مونچھ، اونچا لمبا قد تھا۔ سلاخوں سے باہر اس کے پیروں کے پاس زمین پہ بیٹھی اس کے گھر سے آئی ہوئی کوئی عورت پوٹلی میں بندھی بڑی بڑی تندروی روٹیاں اور سالن کھول رہی تھی اور وہ ایک ٹک اس کی جانب دیکھتا جا رہا تھا۔ یہ کسی سگھڑ فوٹو گرافر کے کھینچنے والی تصویر تھی۔ کشادہ سا، اندر سے سفید دیواروں والا--- (لیکن جو قیدی کے کرتے اور شلوار کی طرح میلی ہو چکی تھیں)---- کمرہ، دونوں عورت مرد کے آس پاس آدھے نکلے ڈوبے سورج کی تھالی جیسا ہالہ بناتی ہوئی محراب۔ یوں لگا جیسے میکسم گورکی کی آپ بیتی میں سے کوئی منظر دیکھ رہا ہوں۔

6

فول اینڈ فیئر ڈے

پولیس لائن سے کوتوالی جاتے ہوئے ہم بڑے بازار میں سے گزرے تھے۔ کچھ لوگ مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پاکستان میں کئی برسوں سے ہندی فلموں کی آمد بند ہے، لیکن فلمی رسائل خوب بکتے ہیں۔ لاہور میں سنا تھا کہ پبلک ہندوستانی فلموں کے لئے ترستی ہے۔ ڈاکٹر نذیر کی کوٹھی پر طالبات کی ایک ٹولی مجھے ملنے آئی تھی اور ہندی فلموں کے متعلق ان کی واقفیت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا! ایک لڑکی جسے ویزہ کی سہولت تھی، ہر پندرھواڑے امرتسر جا کر نئی فلمیں دیکھ آتی اور پھر سہیلیوں کو اردگرد بٹھا کر ان کی پوری کہانی ایکٹنگ کر کے دکھاتی تھی۔

اپنے ملک کی تعریف سن کر کون نہیں خوش ہوتا، لیکن مجھے تھوڑی حیرت بھی ہوئی۔ آخر ہماری فلموں میں کون سی ایسی بات ہے جو پاکستان کے فلمسازوں کی پہنچ سے باہر ہو گی؟

میری دو فلمیں پاکستان میں چل چکی ہیں، ایک "ہم لوگ" دوسری "پردیسی"۔ "ہم لوگ" تو پابندی لگنے سے پہلے ہی گئی ہوئی ہے اور "پردیسی" مشترکہ ہندو روسی فلم ہونے کے باعث بین الاقوامی قانون کے مطابق پابندی سے آزاد ہے۔ میرے آنے سے کچھ دن پہلے جھنگ کے لوگ شاید اسے تیسری مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ شاید اسی وجہ سے میرا تھوڑا بہت ذکر شروع ہو گیا تھا۔

ہمارے پیچھے پیچھے ایک چھوٹی سی منڈلی بھی کوتوالی پہنچ گئی۔ اس کے آنے سے ہمارا وقار کچھ بڑھ گیا۔

تھانے کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا عموماً ہوا کرتا ہے۔ دیوار کے ساتھ لگے دو بنچوں پر غریب اور متفکر سے لوگ بیٹھے تھے۔ کمرے کے درمیان، ایک بڑی سی میز کے پیچھے کرسیاں

ایک دوسرے کے نزدیک کر کے دو افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خوبصورت چہرے مہرے والا کوئی پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خاندان پشت در پشت پولیس اور فوج میں بھرتی ہوتا آیا ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں اتنے اچھے عہدے تک پہنچ جانے سے اس کے جیون کی ساری خواہشات پوری ہو گئی ہیں۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی' بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں تھکن آلود تھیں' جیسے فرض شناسی کا بھرپور لطف اٹھاتے ہوئے ایک دو راتوں سے گھر جانے کی بھی فرصت نہ ملی ہو۔ دوسرا افسر' جسے وہ کوئی رپورٹ لکھوا رہا تھا' ادھیڑ عمر کا تھا اور صحیح معنوں میں پلپلیا معلوم ہوتا تھا--- خضاب لگا کر کالے کئے ہوئے کھچڑی بال' سرمے والی مست آنکھیں' اکڑی ہوئی پیچ دار مونچھ۔ محدود عقل کا آدمی لگتا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں فلم ایکٹر ہوں تو بڑا مشتاق ہوا۔

"پھا جی؟ یہ تو پھر ہماری بڑی خش کسمتی ہے۔ ذرا ہمیں بھی اپنے ہنر کے جوہر دکھا دیں' رنگ بھر دیں جھنگ میں پھر؟"

میری کرسی کے ساتھ لگ کر کھڑے ایک لڑکے نے تنگ کر کہا' "بھائی صاحب! یہ فلم اسٹار ہیں' بھانڈ نقالئے نہیں۔"

"فیر وی گانا گونا تو گاتے ای ہوں گے۔" افسر نے اپنی باریک اور سریلی آواز میں کہا اور ساتھ اپنا لکھنے کا کام بھی کرتا گیا۔

چھوٹی عمر کے افسر نے اپنی خوبصورت آنکھیں اٹھا کر لحظہ بھر میری جانب دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا' جیسے اپنے دفتر میں کسی دوسرے کا مرکز توجہ بننا اسے ناپسند ہو۔ اور واقعی اس کا قیامت خیز مردانہ حسن اچھے سے اچھے فلمی ہیرو کو مات کرتا تھا۔ اپنی کالے بلیزر کی ٹوپی ترچھی ادا سے سر پہ رکھ کر پیٹی باندھتے باندھتے وہ یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ "ان کا کام کر چھوڑو' فالتو باتوں کا کیا فیدہ!؟"

پاکستان کی پولیس کے لباس میں خوش وضعی ہے۔ سرخ پٹے اور اونچے طرے والی پگ جسے انگریز دور میں دیکھ کر آدمی خواہ مخواہ ڈر جاتا تھا' اور جو مشرقی پنجاب میں بھی مروج ہے' نہیں رہی۔ اس کی بجائے ہوبہو فوجیوں والی وردی استعمال ہوتی ہے--- خاکی پتلون' خاکی قمیض اور کالی بیریٹ (Beret) ٹوپی۔ یہ پوشاک زیادہ بہتر نظر آتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد دوسرے افسر نے پاسپورٹ کا معائنہ کر کے کورے کاغذ پر اپنے دستخط کر دیئے اور رجسٹر میں اندراج بھی کر لیا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکان ناچ رہی تھی جیسے دل ہی دل میں کہہ رہا ہو "ان لڑکوں کو کیا پتا؟ یہ ایکٹر لوگ چاہے امیر اور شہرت یافتہ کیوں نہ ہوں'

درجہ ان کا بھانڈوں نقالوں والا ہی ہوتا ہے۔ پیشہ ہی ایسا ہوا۔"

شاید اسے پرانے وقتوں کے دیکھے ہوئے میلے ٹھیلے یاد آ رہے ہوں' جب سفری ناٹک منڈلیاں منڈوے لگایا کرتی تھیں۔ بڑی بڑی نامور ایکٹرسوں کو پولیس افسروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا پڑتا تھا اور چھوٹی موٹی تو ان کے ہاتھ میں کھولنا بن جاتی تھیں۔ کمپنیوں کے مالک بڑے طریقوں سے سمجھاتے' "دیکھ نا بلی' تیری بھی اور ہماری بھی روزی کا سوال ہے۔ کتنا خرچہ کر کے کلکتہ سے آئے ہیں۔ سب کچھ پولیس والوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ان کے مطالبات پورے کئے بغیر ایک شو بھی نہیں کر سکتے۔ بس روٹی ووٹی کھانے ہی تو جانا ہے۔ کہتے ہیں بڑی خوبصورت دیکھنے والی جگہ ہے۔ تم فکر نہ کرو کسی بات کا۔ تمہاری عزت ہماری اپنی عزت ہے۔"

پاسپورٹ لوٹاتے ہوئے اس نے میری جانب یوں دیکھا جیسے میں اس کی دلی خواہشات کو زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہوں۔ اس تحقیر آمیز نظر کی وجہ سے میں کوتوالی میں بھی بڑی بے عزتی کا احساس لئے باہر آیا۔

کیا فلمی میدان میں اتنی ہی گندگی اب بھی موجود نہیں؟ فرق محض اتنا ہے کہ افسری کی دھونس کی جگہ پیسے کی سرداری نے لے لی ہے۔ اوپر اوپر سے سماج میں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی بہت عزت ہے' لیکن اس کی تہہ میں کیا وہی جذبہ اور تعظیم نہیں؟ فن کے ماہرین اور محبان کے معیار کیا برہنگی سے بھرپور نمائشی سحر انگیزی سے بلند ہو سکے ہیں؟

ٹولی کی ہمراہی میں ہم تاریک اور کچی سڑکوں پر نکل آئے۔ لڑکے بڑے شوق سے اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ جو میرے حق میں انسپکٹر سے بولا تھا' وہ میرے اپنے وطن راولپنڈی کا تھا۔ اس نے خاکی ٹویل کی قمیض' خاکی شلوار اور پاؤں میں پشاوری چپل پہنی ہوئی تھی۔ سکول کے زمانے تک میرا بھی یہ لباس ہوتا تھا۔ میں بھی اسی کی طرح گورا چٹا اور ہنس مکھ تھا۔ منہ پر داڑھی بھی اسی طرح پھوٹ رہی تھی۔ بال بھی اسی جیسے گھنے گھنے اور بھورے بھورے۔ یوں لگتا تھا میرا اپنا انتہائی خوبصورت روپ میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ ایک دو نامہ نگار تھے' کچھ کالج کے طالب علم اور کچھ ملازم پیشہ۔ میرے ترقی پسندانہ اور عوام پرست خیالات والا اداکار ہونے کی جھوٹی یا سچی خبران تک بھی پہنچ چکی تھی۔ سب بہت محبت سے پیش آ رہے تھے' لیکن مجھے یہ سب محض تماشا لگ رہا تھا۔

ایک نامہ نگار یہ سن کر بہت دکھی ہوا کہ مجھے گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر ذیل گھر میں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ٹھہرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کہنے لگا" "آپ تانگے میں بیٹھ کر گیسٹ ہاؤس میں چلیں' میں ابھی اے۔ ڈی۔ ایم صاحب سے اجازت لے کر آ رہا ہوں۔" کافی ضبط رکھنے کے باوجود میری طبیعت میں درشتی آ گئی تھی۔

گیسٹ ہاؤس میں بیرے نے بڑی محنت سے میرا کمرہ سجا رکھا تھا' بستر کھول کر پلنگ پہ بچھا دیا تھا۔ انگیٹھی کے پاس پالش شدہ بوٹ پڑے تھے۔ اس ترتیب کو خراب کرتے ہوئے اسے بھی دکھ ہوا۔ میری حالت تو یہ تھی کہ خود ترسی کے مارے رونے والا ہو رہا تھا۔ تقی صاحب سامان باندھنے میں مدد کرنا چاہتے تھے' لیکن ڈرتے تھے کہ کہیں میں انہیں بھی جھڑ نہ دوں۔

میرے دل میں رہ رہ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ نجانے کیسی جگہ جا رہا ہوں؟ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا بیتے گی؟ شہر "مہاجرین" سے بھرا پا ہے۔ س ب انجم تقی جیسے شریف تو نہیں ہو سکتے۔ کیا معلوم کسی کو اپنی چھاتی کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع مل جائے۔ مجھے ماں یاد آئی۔ کتنا روکا تھا اس نے..........

چھوٹا موٹا سامان اٹھانے کے بہانے میں غسل خانے میں چلا گیا۔ دروازہ بند کر کے خود کو بہت سرزنش کی۔ کیا گیسٹ ہاؤس میں حادثہ پیش نہیں آ سکتا؟ بھلا انگریزی طرز کے گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹلوں میں رہ کر میں یہاں کے لوگوں کا اصلی جیون کیسے دیکھ سکتا تھا؟ پولیس انسپکٹر نے تو دراصل مجھ پر بہت بڑی مہربانی کر دی ہے' عام لوگوں کے درمیان رہنے کا موقع مہیا کیا ہے' جو کہ مجھے بمبئی میں بھی نہیں ملتا۔ یہی تمنا لے کر تو میں پاکستان آیا تھا------ جی بھر کے لوگوں کی بولی سن سکوں گا۔ یہ تو مجھے منہ مانگی مراد مل گئی۔

فی الوقت میرا حوصلہ قائم ہو گیا۔ انجم تقی بھی یہ تبدیلی دیکھ کر خوش ہوئے اور ہم نے پھر خالص ہندی میں بات چیت شروع کر دی۔

جھنگ' 13 اکتوبر۔ ہفتہ

"Such foul and fair a day i have not Seen" (Macbeth)

ذیل گھر میں بے آرامی سے رات گزری۔ جگہ بری نہیں تھی' متوسط درجے کے ہوٹل جیسی۔ بازار میں ہونے کے باوجود الگ تھلگ تھی' کیونکہ سامنے باغیچہ تھا۔ اندر کھلے صحن کے اردگرد برآمدے اور کمرے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک کونے والا کمرہ مل گیا' جس کے ساتھ غسل خانہ بھی تھا۔ فرنیچر نہ ہونے کے برابر' لیکن کمرہ خوبصورت اور کشادہ تھا۔ چھت پہ بجلی کا پنکھا بھی لگا تھا جو چلتے وقت کافی زور دار "کھڑ کھڑ" کرتا تھا۔ ہمارے کھڑے

کھڑے ہی مہتر نے گرد اڑا اڑا کر صفائی کی اور ایک بوڑھے سے ماشکی نے ٹب میں پانی بھر دیا۔ روٹی تقی صاحب کے گھر سے کھا آیا تھا۔ ہر ممکن عجلت کے ساتھ دروازوں کی چٹخنیاں چڑھانے اور بستر کھول کر لیٹنے کی کی۔

کھڑکیوں میں سے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ کسی شاخ پر بلبل بول رہی تھی۔ لحظہ بھر کے لئے دل ماضی میں کھو گیا' جیسے گرمیوں کی تعطیلات گزار کر پنڈی سے آج ہی لاہور آیا ہوں اور کالج کے ہاسٹل میں ڈیرہ جما لیا ہو۔ ذیل گھر کی عمارت کو دیکھ کر پہلی نظر میں شک بھی گزرا کہ شاید کسی زمانے میں یہ سکول یا کالج کا ہاسٹل رہی ہو گی۔

لیکن راحت رساں خیالات دل کو موافق نہیں آ رہے تھے۔ خیال بار بار پولیس کے رویہ کی جانب جاتا۔ میں صرف سیر و سیاحت اور اپنے وطن کے دیدار کی خاطر پاکستان آیا تھا' محض ایک مہمان بن کر۔ کوئی بھی ایسی ویسی حرکت' جو کسی مہمان کے لئے ناجائز ہو' میری نظر میں کفر تھی۔ لیکن اس کے باوجود اگر میرے ساتھ گناہگاروں جیسا سلوک ہوتا ہے اور اتنی آزادی نصیب نہیں ہوتی جو سیر کا لطف قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو' تو پھر پیرول پر نکلے قیدی کی طرح بھٹکنے سے کیا فائدہ؟

کتنا ناداں ہوں میں۔ کوئی پوچھ گچھ کئے بغیر منہ اٹھا کر اکیلا نکل کھڑا ہوا۔ کم از کم کوئی دکھ سکھ بانٹنے کے لئے ساتھ ہی ہوتا' دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے۔ تقی انجم کیا سوچتا ہو گا' ممکن ہے کل اس سے ملاقات ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر نذیر نے دوسرا نام شاید شیر افضل جعفری کا دیا تھا۔ وہ' انجم نے بتایا تھا' جھنگ سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ سچ مچ گئے ہوئے تھے' یا یہ نہ ملنے کا بہانہ ہے؟

تقریباً" ساری رات ہی کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ ذرا دیر آنکھ لگتی اور پھر سوچوں کے اکھاڑے میں دھینگا مشتی شروع ہو جاتی۔ اس کا ایک مزیدار پہلو بھی تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرا دل جھنگ کی بولی بولنے لگا ہے' جیسے اس نے کان پڑی آوازوں کا ریکارڈ بنا لیا ہو۔ "کیڈیاں امیداں لا کے گھروں ٹریا ساں۔ پتا نئیں ہائی نا ریت دے تھلیاں واکن ڈھہہ و-سن۔ جے دھمائیں میںڈی ایتھوں خیری مری کوچ تھی ویجے تاں' مائی ہیر' تینڈے ناں اتے اکوتر سو نفل...." (کتنی امیدیں لے کر گھر سے چلا تھا۔ پتہ تو نہیں تھا کہ ریت کے ٹیلوں کی مانند ختم ہو جائیں گی۔ اگر یہاں سے بحفاظت روانہ ہو گیا تو' مائی ہیر' تیرے نام پر ایک سو ایک نفل......)

بھلا یہ "نفل" کیا چیز ہوتی ہے؟

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

آخر کار میں ایک فیصلے پر پہنچا۔ صبح اپنا سب سے اچھا سوٹ پہن کر سیدھا ڈپٹی کمشنر یا ایس۔ پی پولیس سے ملاقات کروں گا۔ کھل کر ساری بات کروں گا۔ اگر اس کے بعد پروگرام کے مطابق آگے جانے کا کوئی مطلب نظر آیا تو ٹھیک ہے' ورنہ پہلی گاڑی سے واپس لاہور اور آگے دہلی۔

اس فیصلے سے دل تو سنبھلا' لیکن نئی جگہ ہونے کی وجہ سے نیند پھر بھی نہ آئی۔ چارپائی میں کھٹمل بھی تھے اور کبھی کبھار مچھر بھی چکر لگا جاتے۔ چارپائی گھسیٹ کر پنکھے کے عین نیچے لے آیا' لیکن اب ڈر اس بات کا تھا کہیں "کھڑ کھڑ" کرتا ہوا وہ اوپر ہی نہ آ گرے۔ صرف یہی نہیں۔ سرائے میں کوئی ہلکی سی سرسراہٹ ہوتی تو میرے کان کھڑے ہو جاتے۔

آخر اپنے دل بے چین کو سزا دینے کا مرتاضانہ علاج کیا۔ سوٹ کیس میں سے میلے کپڑے نکال کر انہیں غسل خانے میں کوٹنے لگا۔ جرابیں' بنیانیں' نائیلون کی قمیضیں' سب کچھ دھو ڈالا' حتی کہ لباب بھرا ٹب خالی ہو گیا۔ اس کے بعد خود کو مزید تھکانے کے لئے ڈنڈ بیٹھکیں نکالیں' پھر جا کر کہیں نیند آئی۔ اس وقت مرغ اذان دینا شروع ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد اخبار بیچنے والوں کی آوازوں نے جگا دیا۔ ان کی آوازیں اتنی دھماکے دار نہیں تھیں جتنی دہلی چپل گھر میں سنی تھیں۔ وہاں تو ایک "سنڈے ایڈیشن" بیچنے والے نے ایک دن کھڑکی کے پاس آ کر اس قدر زور سے "سنڈے" کہا تھا کہ میں ڈر کر چارپائی سے نیچے گر گیا تھا۔ لیکن یہ جھنگ کی بولی کی طرح میٹھی میٹھی آواز لگاتے تھے' جیسے سوئے ہوؤں کی نیند خراب کرنے کا پچھتاوا بھی ہو' لیکن موسم سرما کی مکھی کی طرح چٹ جانے والے تھے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند دیکھ کر یہ نہیں کہ آگے گزر جائیں۔ کھڑے ہو کر لگاتار آواز لگائے جاتے' اور جواب نہ ملتا دیکھ کر اسے کھٹکھٹانے بھی لگتے۔ میں نے کوئی چار مرتبہ اٹھ کر اخبار خریدا ہو گا' سبھی اردو میں۔ اگر کہتا "بھائی میں پہلے ہی خرید چکا ہوں۔" تو جواب ملتا' "ایک ہم سے بھی خرید لو نا' اللہ شان قائم رکھے۔" شاید انہوں نے بھی میری بو پالی تھی۔

یہ لوگ لڑکے بالے نہیں بلکہ اچھی شکل والے گھبرو تھے۔ ان کا اس وقت ہل پنجالی اٹھا کر کھیتوں کی جانب روانہ ہونا زیادہ فطری ہوتا۔ یوں پورا زور لگا کر اخبار بیچنا غربت کا غماز بھی تھا۔ یہ نجانے کن گاؤں کے لوگ تھے؟ سنا تھا کہ ساندل بار کا بہت سا علاقہ سیم زدہ ہو گیا ہے اور جٹوں کی پریشانیاں بڑھ گئی ہیں۔ رات کے وقت جب میں نے ماشکی کو اٹھنی دی

تو اس نے اتنی دعائیں دیں کہ میرا دل بھر آیا۔

ابھی تک صرف چھ بجے تھے۔ نرم نرم اور میٹھی میٹھی ٹھنڈ تھی۔ میں دروازہ بند کر کے پھر سو گیا۔ اٹھنے کی کوئی جلدی بھی تو نہیں تھی۔ کسی بڑے افسر کو ملنے کے علاوہ میرا اور کوئی پروگرام نہ تھا۔ تھوڑی دیر ہی سویا ہوں گا' پھر دروازہ کھٹکا۔ شاید کوئی ملازم چائے لے آیا ہو؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ سرائے ہے' کوئی ہوٹل تو نہیں۔ بے دلی سے دروازہ کھولا۔ وہی نامہ نگار کھڑا تھا' جس سے رات کو تقی انجم نے تعارف کرایا تھا! نام بھول گیا تھا۔ اس کا لباس یورپی انداز کا اور صبح صبح ہی منہ میں پان تھا۔ یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ پنجابی ہے یا یو پی کا۔ بھلا اس وقت اسے مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟

میں نے رسماً پوچھا' "فرمایئے؟"

"میرا نام بلال زبیری ہے' پاکستان ٹائمز' امروز اور کچھ دوسرے اخبارات کا نمائندہ ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا میں رات کو آپ سے ملا تھا۔ تقی انجم میرے پیارے دوست ہیں۔"

"جی ہاں' وہ تو مجھے اچھی طرح یاد ہے' لیکن اس وقت میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ اتنی اچھی اردو بولتا تھا کہ اس کے پنجابی ہونے پر مجھے شک بھی نہ ہوا' ورنہ تکلف کی دیوار شاید ٹوٹ ہی جاتی۔

بلال نے ہنس کر جواب دیا' "خدمت کا شرف تو میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو اندر آ جاؤں؟"

"دیکھئے" میں نے اپنی آواز پہ زرہ بکتر چڑھا لیا' "ابھی تو اٹھا ہی ہوں۔ اگر آپ گھنٹے بھر بعد تشریف لائے آئیں تو......"

اس کے ماتھے پر پھر بھی شکن نہ آئی' "ہاں ہاں اچھی بات ہے' آپ تیار ہو جایئے۔ مگر آج کے لئے پروگرام کیا سوچا ہے آپ نے؟ تقی انجم تو نو بجے کالج چلے جائیں گے۔ آپ کیا کریں گے؟"

"میں پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا پولیس سپرنٹنڈنٹ سے ملوں گا۔ باقی پروگرام بعد میں بنا سکوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس۔ پی تو کسی قتل کی واردات کے سلسلہ میں جھنگ سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر اے۔ ڈی۔ ایم سے ملنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو لے چلوں گا۔"

"شکریہ!" اب مجھے اپنی بے مروتی پر پشیمان ہونا پڑ رہا تھا' "آیئے بیٹھئے نا' میں ابھی چائے منگواتا ہوں۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"نہیں، چائے بعد میں پئیں گے، پہلے آپ تیار ہو جائیے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے مجھے بلانے کے لئے اپنے چھوٹے بھائی عباس کو بھیجا کہ "بھیا اپنے دفتر میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔۔ جاؤں یا نہیں؟ پتہ نہیں کہاں ہے دفتر؟ رات کو کوئی پروگرام طے نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ دل پھر برے خیالات کی راہ پر چل نکلا۔ لیکن پہلے بھی بلال زبیری سے روکھا پیش آ چکا تھا۔ رات کو فیصلہ بھی کیا تھا بزدلی کو نزدیک نہ آنے دینے کا۔ چاہے اندر سے دل کتنا ہی اچاٹ ہو! کمرے کو تالا لگا کر چابی جیب میں ڈالی اور لڑکے کے ساتھ چل دیا۔

بڑے بازار میں سے گزر کر ہم ایک تنگ سے بازار میں داخل ہوئے۔ بڑا بازار بھی زیادہ صاف ستھرا نہیں تھا، لیکن یہ چھوٹا تو، جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، کافی گندا لگنے لگا۔ مکھیوں کی اس قدر بھرمار میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے ان کی بارش ہو رہی ہے۔ لوگ بھی صحت مند نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن شہری زندگی کو مجموعی اعتبار سے خوبصورت اور ستھرا بنانے کی ضرورت میرے خیال میں پنجابیوں کو ابھی محسوس ہی نہیں ہوئی۔ گذشتہ برس امرتسر میں میں نے کوئی کم غلاظت نہیں دیکھی تھی۔ ہم پنجابی دوسرے علاقوں کے لوگوں کی نکتہ چینی کرنے میں بہت مزہ اٹھاتے ہیں: "وہ جی کشمیری بڑے گندے ہیں! وہ جی مدراسی، ان کو تو چاول کھاتے دیکھ کر کراہت آتی ہے! وہ جی بنگالی ہر وقت پان کھا کھا کر تھوکتے رہتے ہیں!" لیکن اپنی پیڑھی کے نیچے ڈنڈا پھیرنے کی ہم نے زحمت نہیں کی۔ کوئی دو سال ہوئے میں مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے شہر "احمد نگر" گیا تھا، وہی احمد نگر جہاں کانگریسی لیڈر 1942ء کی تحریک میں نظر بند کیے گئے تھے۔ کل آبادی کوئی ستر ہزار ہے۔۔۔۔ امرتسر کا تیسرا یا چوتھا حصہ۔ لیکن یہاں کی میونسپل کمیٹی کی جانب سے کیے گئے انتظامات کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ شہر میں کہیں بھی کھلے گٹر نہیں۔ شہر کے مرکز میں نئے ڈیزائن کی پکی اور شاندار مارکیٹ بنائی گئی ہے۔ سب دکانیں یہیں لگتی ہیں۔ مارکیٹ کی اوپر والی منزل پر مطالعاتی کمرے بنائے گئے ہیں جن میں شام کے وقت غریب طالب علم، جن کے گھروں میں پڑھنے لکھنے کی جگہ نہیں، بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ ان کے لئے نہ صرف کرسیاں میز اور الماریوں بلکہ پنکھوں تک کا انتظام ہے۔ مارکیٹ کے اوپر گھنٹہ گھر ہے۔ صبح چھ بجتے ساتھ ہی گھڑی پندرہ منٹ تک شہنائی کا ریکارڈ بجاتی ہے۔ شہریوں کے دلوں کو جھنجوڑنے کی خاطر۔ میونسپلٹی کی اپنی ایک لیبارٹری ہے، جس میں ایکسرے کا اور دیگر ہر قسم

کے ٹیسٹ کرنے کا بندوبست ہے۔ سکول جانے والے ہر بچے کی مفت طبی دیکھ بھال کی جاتی ہے، تاکہ اس کی جسمانی صحت کا انتظام کیا جا سکے۔ میونسپلٹی کی جانب سے ایک تین منزلہ میٹرنٹی ہوم بنایا گیا ہے۔ یہاں غریب عورتوں کو صرف ایک روپیہ روزانہ ادا کرنا پڑتا ہے اور کوئی فیس نہیں۔ میونسپلٹی کی جانب سے شادی بیاہ جیسی تقریبات کے لئے ایک بڑا سا ہال بنایا

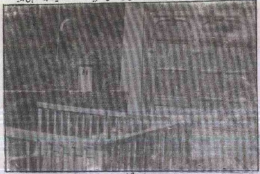

بھرے میں آبائی گھر کی چھت

گیا ہے جو مذہب، ذات پات سے قطع نظر ہر شہری کے لئے میسر ہے۔ میونسپلٹی نے پارک میں لوگوں کی تیراکی کے لئے تالاب بھی بنایا ہے جس کا سائز اولمپک معیار کے مطابق ہے اور بمبئی یا دہلی کے کسی ممتاز کلب کے تالاب سے کم نہیں۔ شہر کا اپنا اوپن ائیر تھیٹر ہے۔ اور تو اور شمشان بھومی (مردے جلانے کی جگہ) کو ایک پرسکون جگہ بنا دیا گیا ہے۔ یہاں نہلانے دھلانے کا انتظام ہے۔ عبادت کے لئے چبوترہ بنایا ہے۔ لکڑیاں بازار کے مقابلہ میں بہت ارزاں قیمت پر مل جاتی ہیں۔ چتاؤں پر ٹین کے شیڈ بنا دیے گئے ہیں تاکہ بارش کے وقت بھی کوئی مسئلہ نہ ہو اور میں نے یہ سب دیکھ کر محسوس کیا کہ ہم پنجابیوں کو ابھی دوسروں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ لیکن ایسا تبھی ممکن ہے جب ہم بے معنی بات پر مر مٹنے کا خیال ترک کر کے زندگی کو بلند تر سطح سے دیکھنے کے قابل بنائیں۔

بلال زبیری کا دفتر ایک تنگ سی گلی میں تھا۔ اتنا چھوٹا کہ کھلونا سا لگتا تھا۔ لیکن ٹیلی فون لگا ہوا تھا اور میز پر آج کے اخبارات کا ڈھیر تھا۔ میں نے صبح اخبارات خریدے لیکن

پڑھے نہیں تھے۔ بلال نے بڑی خوش دلی سے کہا کہ وہ مجھے خود لینے اس لئے نہیں آ سکا کیونکہ اے۔ ڈی ایم صاحب سے فون پر ملنے کا وقت لینا تھا۔ اسی لئے اب بھی فون کے پاس بیٹھا تھا۔ میرا بھٹکا ہوا دل اپنے اوچھے پن پر شرمسار ہوا اور پوری طرح صدق والی راہ پر آ گیا۔

میز پر پڑے اردو اخبارات میں نے اٹھا اٹھا کر دیکھنے شروع کئے۔۔۔ کوہستان' غریب' امروز۔ ایک بات دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔۔۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر تاریخ صرف عیسوی اور ہجری سن ہی نہیں' بلکہ بکری سال میں بھی دی ہوئی تھی

13 اکتوبر 1962ء' بروز ہفتہ۔

۱۳ جمادی الاول ۱۳۸۲ھ۔

21 آسون (اسو) 2014 (ب)

میں نے بلال سے کہا' "یہاں اخبارات میں بکری سال بھی چھاپتے ہیں؟"

جواب میں وہ لاپروائی سے بولا' "اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟"

لیکن میرے سوال پر وہ دل میں خوش لگتا تھا۔ اس کے چہرے کا تاثر کہہ رہا تھا "ہم لوگ اتنے متعصب نہیں' جتنا آپ ہمیں سمجھتے ہیں!"

لیکن یہ حیران کن بات تو تھی ہی' کیونکہ پاکستانی پنجاب میں ہندوؤں کی تعداد آٹے میں نمک برابر بھی نہیں تھی۔ اس کی وجہ ایک ہی نظر آتی تھی' وہ یہ کہ شہروں اور دیہات کی مفلس آبادی ابھی تک مہینوں کو چیتر' وساکھ' جیٹھ' ہاڑ' وغیرہ ناموں سے ہی جانتی ہے۔ اخبارات والوں کی مجبوراً' بکری سال چھاپنا پڑتا ہے۔

ٹیلی فون کی مصروفیت سے فارغ ہونے سے پہلے ہی گھر کے اندر سے ناشتے کی طشتریاں آنا شروع ہو گئیں۔۔۔ آملیٹ' ٹوسٹ' سیب انگور' کیلا' مٹھائی' چائے۔۔۔۔

"میں تو ناشتہ کر آیا ہوں! عباس سے پوچھ لیں۔"

"عباس دروازے کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا' "ایک بار پھر کر لیں۔"

کسی نے انکار نہ مانا۔

دوبارہ ناشتہ کرنا پڑا۔ ناشتے کے بعد پان دان بھی سامنے آ گیا۔ دہلی اور لکھنؤ کے لوگ بڑی تعداد میں جھنگ میں آ کر آباد ہو گئے اور پان خوب زور و شور سے عام کر دیا ہے۔ بلال ہر وقت پان کھاتا ہے' اسی لئے مجھے اس کے غیر پنجابی ہونے کا شک ہوا تھا۔

اے۔ ڈی۔ ایم صاحب کچہری میں کسی مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ انہوں نے

مجھے بڑی عزت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بلال عدالت کے عام ہجوم میں کھڑا ہماری جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے مجھے اونچے عہدے پر پہنچا کر خوش ہو رہا ہو۔ اس کی عمر 35 سال کے لگ بھگ ہو گی' لیکن اس وقت بالکل لڑکا سا لگ رہا تھا۔ اس کے گورے مکھڑے پر اپنائیت کی گرمجوشی تھی۔ اب مجھے لگا کہ اس کا قد چاہے زیادہ بڑا نہیں' پھر بھی وہ بڑا حسین آدمی ہے اور اس کی آنکھوں میں کمال دانشوری کا نور ہے۔

اے۔ ڈی۔ ایم صاحب بہت ہی دوستانہ آدمی تھے۔ دہلی کے پیدائشی ہونے کی وجہ سے بہت ہی اعلیٰ اور چست اردو بولتے تھے۔ جب میں نے آپ بیتی سنائی تو ان کے منہ سے وارفتہ کچھ شعر نکلے جن میں جذبات کی اتنی تڑپ تھی کہ میری آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ دیس کے پردیس بن جانے کے مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ یہی مسئلہ انہیں بھی درپیش ہوتا ہے جب بھی وطن کی کشش انہیں دہلی لے جاتی ہے۔ اسی طرح دل اچاٹ ہو جاتا ہے' پابندیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس بات کو زیادہ دل پر لینے کی ضرورت نہیں۔ پھر میرے سفر کے پروگرام سے متعلق پوچھا اور کچھ ضروری ہدایات دیں۔ میرا اگلا پڑاؤ بھیرہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ بھیرہ جانے کے لئے پہلے مجھے سرگودھا اتر کر ضلعی سکیورٹی آفس سے اجازت حاصل کرنا ہو گی۔ کل اتوار ہے' دفتر بند ہوں گے۔ اس لئے جھنگ سے پرسوں روانگی بہتر ہے تاکہ پھر ایسی مشکل پیش نہ آئے' وغیرہ۔ آخر کار انہوں نے مجھے بنگلے پر شام کی چائے پینے کی دعوت دی جسے میں نے بڑی خوشی سے قبول کیا۔

کچہری کے دفتر میں ہی بلال کے بڑے بھائی صاحب کام کرتے تھے۔ ان سے ملنے گئے۔ پھر چائے پی۔ ان کے دفتر کے دو مزید ساتھی بھی مل گئے۔ بلال نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں خصوصاً" جھنگ کی بولی سننے اور ہیر کا مقبرہ دیکھنے آیا ہوں۔ انہوں نے ساتھ والے کمرے میں سے ایک اور آدمی کو بلا بھیجا' جس کا لباس بھی پینڈو (دیہاتی) اور بولی بھی ٹھیٹھ تھی۔ اس نے ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیئے۔ شہریوں کی مخلوط بولی کا نقشہ اس نے یوں کھینچا: "منہ گوکا" کر ماجھا اور بنتھ (چوتڑ) باکری۔"

وہاں سے تانگے میں سوار ہو کر جیپ بینک جا رہے تھے کہ راستے میں کوئی گلزار صاحب مل گئے۔۔۔ کلا تہہ دار ٹوپی' سرمئی رنگ کی اچکن اور سفید شلوار' کندھے پر بندوق رکھے' سائیکل پر سوار ہو کر بندوق ٹھیک کرانے جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں سوچوں میں پڑ گیا کہ پہلے کہیں انہیں دیکھا ہوا ہے! بڑا ہی جانا پہچانا حلیہ تھا۔ انجم تقی کے دوست شیری صاحب کو دیکھ کر بھی مجھے یہی دھوکا ہوا تھا۔ اس طرح کا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دھوکا پاکستان کی سیر کے دوران مجھے لاتعداد مرتبہ ہوا۔ ہر جگہ اور ہر روز کوئی نہ کوئی آدمی ایسا نظر آ جاتا جس کو دیکھ کر شک ہی نہ گزرتا بلکہ یقین ہو جاتا کہ میں اسے پہلے سے جانتا ہوں، حالانکہ ایسا کوئی امکان ہی نہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان جانے والے دوسرے سیاحوں کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے یا نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ اپنے اس احساس کا کوئی سبب سمجھ نہ آیا۔

گلزار صاحب بھی سائیکل موڑ کر ہمارے تانگے کے ساتھ ہو لئے۔ حبیب بینک کے مینجر صاحب کے کمرے میں پھر دعوت تیار تھی! ار کلے، گلاب جامن، سموسے، چائے۔ جیسے اوپر بیان کر آیا ہوں۔۔۔ انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آج صبح سے شروع ہو کر اگلے تیرہ دن۔۔۔ جو میں نے پاکستان میں گزارے۔۔۔ میں اوسطاً "تین ناشتے، دو لنچ، شام کی تین چار چائے اور دو تین ڈنر ہر روز کھاتا رہا۔ اسی سے وہاں کے باشندوں کی مہمان نوازی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شرادھ کے دنوں میں جو حال براہمنوں کا ہوتا ہے وہی میرا تھا۔ لیکن ان کی طرح نہ تو کبھی میرا ہاضمہ بگڑا اور نہ مجھے کبھی دوا دارو کی ضرورت پڑی۔ اس سے ان علاقوں کی اچھی آب و ہوا اور مجھ پر اس کے خوشگوار اثر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

حبیب بینک والی ملاقات میں طے پایا کہ گلزار خان صاحب کل رات کو مینجر صاحب کی کوٹھی کے احاطہ میں جھمے سی، وغیرہ لوک ناچ دکھانے کا بندوبست کریں گے۔

تقریباً" اڑھائی بجے بلال اور میں تقی انجم کے گھر پہنچے۔ شیری صاحب بھی منتظر تھے اور کھانا بھی تیار تھا۔ کباب، تکیاں، پلاؤ، بیر۔ اور انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا!

کھانے کی میز پر شیری صاحب اور بلال صاحب کی آپس میں بات چیت شروع ہوئی جو قابل ذکر ہے۔ تین چار دن پہلے شیری صاحب کی بیوی کا مقامی سرکاری ہسپتال میں شدید قسم کا آپریشن ہوا۔ شیری صاحب جھنگ میں یہ آپریشن کروانا چاہتے تھے، بیوی کو لاہور لے جانا چاہتے تھے، جہاں بدرجہا بہتر سہولیات میسر تھیں۔ لیکن جھنگ ہسپتال کے ڈاکٹر ان کے دوست تھے اور انہوں نے اصرار کیا کہ آپریشن جھنگ میں ہی ہونا چاہئے اور ان کے اپنے "سسٹم" کے مطابق۔

اس "سسٹم" کی خاصیت یہ تھی کہ آپریشن ایک سرجن نہیں، ہسپتال کے تینوں سرجن مل کر کرتے ہیں، کیونکہ جھنگ جیسے چھوٹے شہر میں عطیاتی خون کے ذخیرہ کی قلت ہے۔ ایک سرجن چیر پھاڑ کرتا ہے، دوسرا خون روکنے کی ترکیبیں بتاتا ہے اور تیسرا زخم کو فوراً" سینے کے کام میں لگ جاتا ہے۔

شیری صاحب کی بیوی کے جسم میں پہلے سے خون کی قلت تھی۔ پھر بھی عطیہ خون

کے بغیر کامیاب آپریشن کر دیا گیا اور وہ اب خطرہ سے باہر ہو چکی تھی۔ آپریشن کروانے کے لئے بڑے شہروں کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کی توفیق بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ جھنگ کے ڈاکٹروں نے سینکڑوں جانیں اپنے اس "سسٹم" کی مدد سے بچائی تھیں اور عوام بڑے شکر گزار تھے۔

شیری صاحب بلال کے سامنے منت سماجت کر رہے تھے کہ وہ اخبارات میں ڈاکٹروں کی اس خدمت کے متعلق ان کی جانب سے ایک بیان چھپوائیں۔

"پیسے تو وہ لیتے نہیں، میں ان کی کوئی خدمت تو کر سکوں"" شیری صاحب بڑی جذباتیت سے کہہ رہے تھے۔

بلال نے جواب دیا، "شیری صاحب، مجھے تو اس میں کوئی اعتراض نہیں، بلکہ میرا اپنا دل بہت چاہتا ہے کچھ لکھنے کو۔ لیکن ان لوگوں نے اس بات پر سخت پابندی لگا رکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ان کی اس ایجاد کا ذکر اخبارات میں آ گیا تو بہت ممکن ہے حکومت انہیں ترقیاں دے دے۔ بڑے ہسپتالوں میں تبادلے کر دے۔ اگر ذرا بھی ایسی بات ہو گئی تو ان کی ٹیم ٹوٹ جائے گی، اور "سسٹم" ختم ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے وہ کسی صورت بھی اخبارات میں اس کا تذکرہ نہیں کروانا چاہتے۔ چاہے جھنگ کے اس چھوٹے سے سرکاری ہسپتال میں انہیں بہت زیادہ تنخواہیں نہیں ملتیں اور نہ ہی سہولیات، لیکن انہیں کام کرنے کی آزادی ہے اور ان کے کام سے لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہی ہمارا سب سے بڑا انعام ہے۔"

میں اس گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ واقعی انسانیت کے ہمدرد ہر ملک ہر قوم میں موجود ہیں جو عوامی بھلائی کے لئے اپنے مفادات قربان کر دیتے ہیں اور وہ صرف کسی ایک قوم کے نہیں ہوتے بلکہ ساری انسانیت ان کے سامنے سر جھکاتی ہے۔ ایسے ہی خالص اور ایماندار لوگوں کی قربانی نے انسانی تہذیب کا چہرہ اجلا کیا ہے اور مستقبل بھی انہی کی امید پر قائم ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

7

روٹی کھا کر ہم بیٹھک میں آ بیٹھے۔ کھلے دروازے کی بیچ میں سے باہر تقریباً بارہ برس کی ایک بچی کو گلی کا گند مند صاف کرتے دیکھا۔ شاید کسی اور جگہ پر اور کسی اور وقت اس منظر کو دیکھ کر میرے اندر غم و غصے کا جذبہ جاگ اٹھتا۔ لیکن اس وقت اور ہی اثر ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پنڈی میں اپنے چھاچھی محلے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ پرانی یادوں سے بھرے کسی ڈبے کا جیسے ڈھکن کھل گیا۔

کوئی دو برس ہوئے، موگے میں بھی میرے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ جسونت سنگھ کنول مجھے اپنے کسی ادبی دوست کے گھر لے گیا۔ اندر گھستے ساتھ ہی مجھے ڈیوڑھی ہوبہو اپنے پنڈی والے مکان کی ڈیوڑھی جیسی لگی۔ اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں بھی بالکل ہماری سیڑھیوں جیسی تھیں۔ اوپر پہنچے تو مٹی میں گند مند پھینکنے کے لئے جیسے ہمارا ہی کنستر پڑا ہوا ہو۔ صحن میں بارش سے دھلی ہوئی چوڑی اینٹوں کی تیز رنگ سرخی بھی وہی، اسی طرح کا لوہے کی سلاخوں والا گھر (صحن کے اوپر چھت میں عموماً بنایا جانے والا چوکور سوراخ جس کے اردگرد چھوٹی سی منڈیر ہوتی ہے)۔ پچھلی دیوار کے عین بیچ میں بناوٹی سی انگیٹھی بھی موجود تھی، جس پر چھوٹا موٹا سامان جیسے ہمارے گھر سے ہی لا کر رکھا گیا تھا اور اوپر سوامی دیانند جی کی تصویر، جیسے ہمارے گھر میں تھی۔ مزید اوپر، ہمارے گھر کی طرح ہی، کڑیوں والی چھت، جس کی اینٹوں پر سفیدی کے دوران پڑی ہوئی چھینٹیں، جن میں مجھے بچپن میں بھانت بھانت کی مزیدار تصاویر نظر آیا کرتی تھیں۔ اور پھر جب چائے تیار ہو کر آئی تو اس میں چھوٹی الائچی اور دار چینی کی خوشبو۔ بارش والے دن میری ماں جی کو بھی ایسی ہی چائے بنانے کا شوق تھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر میری آنکھوں نے برستی گھٹاؤں کا سا انداز اپنا لیا۔

میری [illegible] بھی تو چوٹی ہے نا۔ پنجاب کا ایک حصہ مجھ سے چھن گیا اور

دوسرا دور ہو گیا۔ اس لئے جذبات بہت جلدی بہہ نکلتے ہیں۔

پھر بھی، میں سوچنے لگا، وہ کون سے نظر نہ آنے والے زندگی کے بندھن ہیں جن کی مل جل موگے کے مکان میں اور جھنگ کی گلی میں راولپنڈی والے مکان کی مشابہت لے آتی ہے، انجانے اور غیر شناسا چہروں پر شناسائی کی نشانیاں ابھار دیتی ہے۔ سبھی پنجابیوں کی فطرت، رہن سہن، کام کاج اور افعال و حرکات کا جذبہ بھر دیتی ہے، ان کو باقی نوع انسان سے جدا کر دیتی ہے؟ یہ کھوج کرنا شاید کتنی ہی قسم کے سائنس دانوں اور سماجی نظام کے ماہرین کا کام ہے۔ زندگی کے ان دھاگوں کی جڑیں نجانے کتنے سو، کتنے ہزار، کتنے لاکھ سال پرانے زمانے میں پیوستہ ہیں، جو مر کر بھی نہیں مرتا، بار بار حال اور مستقبل میں جی اٹھتا ہے؟

تقسیم ہند نے پنجابیوں کی دھرتی ماں کے پیٹ پر چھری کی نوک سے صرف لکیر ہی نہیں کھینچی بلکہ اسے بہت گہرائی میں چیرا ہے۔ نسوں اور گوشت کے ساتھ ساتھ یہ جیون دھاگے بھی کٹ گئے ہیں۔ ممکن ہے جو مشابہت اب نظر آ رہی ہے ایک دو پشتوں بعد شاید غائب ہو جائے، جیسے چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کافی دیر تک تڑپ کر آخر ٹھنڈی ہو جاتی ہے.........

اس قسم کی بیکار سوچیں سوچتے ہوئے میں نیم دراز ہونے ہی والا تھا، لیکن بلال زبیری، جس نے اب مجھے پوری طرح اپنی نگرانی میں لے لیا تھا، مجھے اٹھا کر کہنے لگا "جھنگ دیکھنے نہیں جانا؟"

واقعی، میری ضروریات مجھ سے زیادہ اسے یاد ہو گئی تھیں۔ بھلا ایسی کیا جلدی؟ ہیر کا مقبرہ تو دیکھ ہی لیا ہے، جھنگ میں اور کیا خاص بات ہے؟ جیسا کھیانا، ویسا ہی جھنگ۔ پھر کل کا سارا دن پڑا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے دل کو مضبوط کیا۔ صبح سے بلال اپنے سارے کام چھوڑ کر میرے ساتھ بھٹکتا پھر رہا تھا۔ کیا اسی کو ہی احسان مندی کہتے ہیں؟ میں کاہلی کو ختم کر کے کھڑا ہو گیا۔

گلی میں سے نکل کر جب ہم میدان میں آئے تو ایک خاکی رنگ کی جیپ سامنے سے آ رہی تھی۔ میری چھاتی میں کچھ سانس پھنس گیا۔ کہیں پولیس تو نہیں؟ اب کیا قصور ہو گیا مجھ سے؟

وہ ایک ممتاز سرکاری افسر کی جیپ تھی۔ اندر ان کے فرزند اور ایک دوستوں کا ٹولہ۔ تعارف کے بعد کہنے لگے، "ہم آپ کی طرف ہی آ رہے تھے، چلیں آپ کو سیر کروا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

آئیں۔"

"بلال صاحب اور میں جھنگ جا رہے تھے۔"

"جھنگ؟" اس نے حیران ہو کر میری جانب دیکھا "وہاں جا کر کیا لینا ہے؟"

"لینا تو کچھ نہیں" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"چھوڑیں پرے جھنگ کو، بیٹھیں ہمارے ساتھ، آپ کو تریموں لے چلیں جو اصل دیکھنے کے قابل جگہ ہے۔"

چناب اور جہلم کے سنگم کو جو یہاں سے کوئی نو میل کے فاصلے پر ہے، تریموں کہتے ہیں۔ بڑی مشہور سیرگاہ ہے۔ وہاں ایک نیا اور شاندار بند بھی ہے۔

"لیکن میرا ویزہ شہر کی حدود سے باہر جانے کا نہیں۔" میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "او چھوڑیں جی ویزے کو" ایک اور آدمی دھڑلے سے بولا، "اس گاڑی کو کون روک سکتا ہے؟"

لیکن میں پولیس کی اجازت کے بغیر جانے پر رضامند نہ ہوا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ کیا پتہ پھر کوئی بات کا بتنگڑ بن جائے۔ میں کسی غلط لالچ کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لیکن چناب اور جہلم (جسے اس علاقہ میں وہت بھی کہتے ہیں) کا سنگم دیکھنا کوئی چھوٹی موٹی تحریص نہیں تھی۔ میں نے تجویز دی کہ اگر وہ مجھے اجازت لے دیں تو بخوشی ان کے ساتھ چلوں گا، بلکہ شکر گزار بھی رہوں گا۔"

لڑکوں نے اس بات کا ذمہ لیا۔ کہا "ڈی۔ سی۔ صاحب رات کو شہر واپس آئیں گے، ہم ان سے اجازت لے لیں گے۔ کل صبح سات بجے انشاء اللہ ہم آپ کو لینے ذیل گھر آ جائیں گے، آپ تیار رہنا۔ نظارہ کرنے کا اچھا وقت وہی ہوتا ہے۔"

انہیں جیپ موڑ کر رخصت ہوتے دیکھ کر بلال دبی آواز میں بولا "شریف لوگو! ہمیں جھنگ تک تو چھوڑ آتے؟"

اس بات کا خیال مجھے بھی آیا تھا۔ "شاید ان کے اندازے کے مطابق ابھی میں بڑا فلم ایکٹر بنا" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ بیچارے نروس ہو گئے ہوں گے۔"

بازار پہنچ کر بلال کو خیال آیا کہ ایک مرتبہ اپنے دفتر کا چکر لگا لینا چاہئے، کہیں کوئی چٹھی وغیرہ نہ آئی ہو۔ ٹھیک بات تھی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ بلکہ اب مجھے اس کے

ساتھ آوارہ گردی کرنے کا عجیب مزہ آنے لگا تھا۔ جیسے میں باہر سے آیا ہوا انجان آدمی نہیں۔ یہیں کا رہنے والا ہوں۔ سیلانی کے لئے اس سے بڑھ کر لطف اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب میں تنگ گلیوں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کو تنقیدی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری اپنی زندگی کا حصہ بن گئی ہوں۔ بلال کے دفتر کے نزدیک ایک گلی میں ڈاک خانہ تھا۔ میری جیب میں نصف درجن رنگین پکچر پوسٹ کارڈ پڑے تھے۔ میں نے بلال سے کہا "آپ اپنا کام کر آئیں، اتنی دیر میں میں اپنے عزیزوں دوستوں کے لئے یہ پکچر پوسٹ کارڈ ڈاک میں ڈال آؤں۔" میں نے بڑے شوق سے پیار بھر پیغامات لکھے۔ ٹکٹیں خرید کر لگائیں اور کچھ اپنی بچی صنوبر کے لئے بطور سوغات رکھ لیں۔ اور جب نیچے کی سیڑھیاں استعمال کرنے کی بجائے چھلانگ لگا کر نیچے اترا تو ایک سائیکل والے سے ٹکرا گیا جو مجھے ہی ملنے آ رہا تھا۔

ابھی میری قسمت کا ستارہ واقعی بلند تھا۔ اس غیر معمولی شخصیت کے مالک آدمی کا نام ہے سید ظفر علی ظفر۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر ہونے کے علاوہ ہندی میں بھی ٹھاٹھ باٹھ کی شاعری کرتے ہیں۔ اپنے بارے میں کہا ہے:

پل پل کیا چولا بدلے اور گھومے آکاش
ہیر نگر کا سید زادہ، بن گیا تلسی داس

سائیکل انہوں نے بلال کے دفتر میں کھڑی کر دی اور ہم تینوں لہراتے ہوئے ایک تانگے میں بیٹھ کر ہیر کی نگری کو چل دیئے۔

میں سارا رستہ بڑے شوق سے ظفر صاحب سے ہندی شاعری سنتا گیا۔ وہ انجم تقی صاحب کے دوست تھے اور یہ سن چکے تھے کہ میں ہندی کا خصوصی شوقین ہوں۔ دراصل یہی کشش انہیں میری جانب لائی تھی۔

ہمارے دیس میں لوگوں کو عموماً یہ بھرم ہے کہ ہر پاکستانی ہندی سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن ان کی نہایت اعلیٰ ہندی نظمیں پڑھ کر کافی حد تک یہ غلط فہمی دور ہو سکتی ہے۔

گھیانا سے جھنگ کوئی دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ سفر غیر دلچسپ ہے، کھیتوں کے سوا کوئی لائق دید چیز نہیں۔ اس لئے ظفر صاحب کی نظمیں سنتے جانے میں سیلانی نکتہ نگاہ سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

اچانک بلال نے سامنے سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار کو آواز دی، "آ گئے ہو خیر سے؟" تانگہ اور سائیکل دونوں پاس پاس ہی رک گئے۔ وہ آدمی اتر کر ہمارے پاس آیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سارا لباس سفید تھا۔ سفید پگ' گھٹنوں تک پہنچتی ہوئی سفید قمیض اور شاں شاں کرتی سفید شلوار۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا تھا' کسی چیز سے بھرا ہوا ـــــ شاید مولیاں تھیں' ٹھیک سے یاد نہیں۔ شکل نہایت کالی' اسی وجہ سے کپڑوں کی سفیدی آنکھوں کو زیادہ چبھتی تھی۔ بڑی بڑی' چست' لیکن ایک دم سفید مونچھیں۔ سارا حلیہ ہی کسی اونچے افسر کے خانسامے جیسا تھا۔

بلال نے تانگے سے اتر کر اس سے رازدرانہ انداز میں سرگوشی شروع کی اور آخر جب وہ چلا گیا تو اس نے بتایا کہ وہی شیر افضل جعفری تھے ـــــ مغربی پاکستان کے چوٹی کے شاعر۔

"یار تو نے حد کر دی۔ میرا تعارف بھی نہ کروایا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے تو انہیں میرے آنے کی پہلے سے ہی اطلاع دے رکھی تھی؟"

"ہاں' بے چین کیوں ہوتے ہیں" بلال نے پھر ایک اچھا منتظم ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کہا' "انہوں نے مجھے بتا دیا ہے۔ معافی مانگ رہے تھے کہ پہلے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ چنیوٹ گئے ہوئے تھے۔ ہم جب جھنگ سے واپس آئیں گے تو وہ تقی انجم صاحب کے گھر ہمارے منتظر ہوں گے۔"

جوں جوں جھنگ شہر کے آثار قریب آتے گئے' میرے من کی حالت ایسی ہوتی گئی جیسے ابھی سے مجھ پر ان کا اثر مرتب ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے دمودر کی ہیر بھی پڑھی تھی۔ لیکن تب پنجابی اٹک اٹک کر پڑھتا تھا۔ جلد ہی تھک جاتا' نجانے کتنے مہینوں میں کتاب ختم کی تھی۔ میں نے اس پر زیادہ غور بھی نہ کیا' کیونکہ میرے دل میں وارث شاہ کے ہی واحد ہیر لکھنے والے کا خیال بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن جھنگ کے قریب آ کر' جھنگ کے لوگوں کی بولی سن سن کر مجھے اب یہ محسوس ہونے لگا کہ وارث شاہ یہاں اجنبی اور بیگانہ ہے۔ میرا دھیان بار بار ہیر دمودر کی جانب جاتا اور وہ مجھے اصلی اور بیش بہا چیز لگتی۔ اس میں چنیوٹ کا نام بھی آیا تھا اور دیگر مقامات کا' جو یہاں آس پاس کے علاقے میں ہوں گے۔ سیال اور کھیڑے آج بھی مشہور ذاتیں ہیں۔ لیکن دمودر نے اور بھی کئی ذاتوں کا نام لیا ہے۔ میں نے دمودر کی ہیر یہاں آنے سے پہلے ایک مرتبہ مزید کیوں نہ پڑھ لی؟ اس کی مدد سے یہاں مجھے کتنے اشارے نظر آتے؟ ہیر کی کہانی کا آخری حصہ وارث شاہ نے بڑے فرضی انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن دمودر کے بیان میں اصلیت اور سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس نے لکھا' "کیسے رنگ پور فرار ہونے کے بعد ہیر اور رانجھے نے ایک ایسے

قبیلے میں پناہ لی جو انہی کی طرح اونچی ذات کے راٹھوں کا تھا' کیسے پرانی راجپوتی روایات کے مطابق ایک قبیلے نے سیالوں سے لڑائی کر کے پناہ گزینوں کی حفاظت کی تھی۔ پھر معاملہ ایک راجہ کے دربار میں پیش ہوا تھا' لیکن اس کے قاضی نے انصاف نہ کیا اور ہیر کو واپس سیالوں کے حوالے کر دیا۔ کھیڑوں نے ہیر کی گردن اور کمر میں رسہ ڈال کر اسے گھوڑے کے پیچھے پیچھے گھسیٹا' سارا رستہ مار مار کر اس کا برا حال کرتے رہے...... بھلا اس راجے کا شہر کتنی دور ہو گا یہاں سے؟......

پچھلے برس میں نے کاٹھیاواڑ کے گاؤں کا چکر لگایا تھا۔ ان میں سے ایک "بھرواڑی" ذات کے لوگوں کا گاؤں تھا۔ یہاں گھستے ہی مجھے لگا جیسے پنجاب میں آ گیا ہوں' حالانکہ یہ لوگ ظاہری اعتبار سے پنجابیوں سے بہت مختلف ہیں۔ پھر ایک اور عجیب واقعہ ہوا تھا۔ جب بھی اس گاؤں کے لوگ آپس میں باتیں کرتے تو مجھے ان کا تھوڑا بہت مقصد سمجھ آ جاتا' حالانکہ میں ان کی گجراتی زبان سے بالکل ناواقف تھا۔ میرا گجراتی دوست' جو مجھے یہ گاؤں دکھانے لایا تھا' یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ واقعی لوگوں کی بات چیت کا منشاء و مدعا میں جان لیتا ہوں۔ ان کی بولی میں کچھ ایسے الفاظ آ جاتے اور ان کا انداز ایسا ہوتا' کہ زبان نہ سمجھتے ہوئے بھی ان کی بات میری سمجھ میں آ جاتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ اندرونی طور پر ان کے ساتھ میری سرگشتہ و گم گشتہ ہم آہنگی ہے۔

گجر قوم نے گجرات بسایا۔ پنجاب میں گجرات' گجرانوالہ' گجر خان وغیرہ شہر بھی اسی قوم کے نشانات ہیں۔ پنجاب میں گجر لوگ پہاڑوں میں ابھی تک ملتے ہیں۔ ان کا کام گائے بھینسیں پالنا اور دودھ مکھن بیچنا ہے' چاہے یہ لوگ اب مسلمان ہو گئے ہیں۔ گجرات کاٹھیاوار کے لوگ کہتے ہیں کہ جب کرشن مہاراج متھرا نگر چھوڑ کر دوارکا چلے آئے تو ہزاروں گوپی اور گوپال ان کے ساتھ تھے' کیونکہ کانہ بنا سونے برج (متھرا کا ضلع جو کرشن کی وجہ سے مشہور ہے) میں رہنا ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اور اس باعث آج بھی گجرات کے دیہات کی تقریباً" بھی شروع سے آباد ذاتوں (جاتیوں) کا پیشہ' گجروں کی طرح' صرف گائے بھینسیں پالنا اور دودھ مکھن بیچنا ہے۔

کاٹھیاواڑی دیہات میں دوہے گانے کا لوگوں کو بہت شوق ہے' جس طرح پنجاب کے کسانوں کو ڈھولے ماہیے گانے کا۔ لیکن دوہے گانے کا شوق پنجاب کے اور بالخصوص جھنگ کے کسانوں کو بھی ہے۔ یہ بات مجھے یہاں آ کر معلوم ہوئی تھی۔

میری تاریخی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے مغربی پنجاب کی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تاریخ گجرات کاٹھیاواڑ سے بہت ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں قوموں کی بولی اور تہذیب میں محققین کے لئے بڑا مواد ہے۔ مشرقی پنجاب مجھے اس اعتبار سے کچھ جدا جدا لگتا ہے۔

مجھے جھنگ کے علاقہ میں کئی ایسی عورتیں نظر آئیں جن کا لباس ہوبہو کاٹھیاواڑی عورتوں والا تھا۔ سرخ لال رنگ کی شیشے جڑی چولیاں' ان کے ساتھ میل کھاتی چنیاں اور گھگرے۔ یہاں انہیں پست ذاتوں کے لوگ کہا جاتا ہے۔ یہ طبقہ شرفاء سے باہر شمار کئے جاتے ہیں۔ یہاں ان کا لباس ایک غیر معمولی اور انوکھی چیز ہے' لیکن کاٹھیاواڑ میں یہ لوگوں میں ایسے گھل مل جائیں کہ انہیں علیحدہ شناخت کرنا مشکل ہو جائے۔

شاید کسی زمانے میں ان کے قبائل نے' مسلمانوں کے لگاتار حملوں کی تاب نہ لا کر' کاٹھیاواڑ اور کچھ کے ریگزاروں کی جانب بھاگ جانے کا فیصلہ کیا ہو گا؟ باقی چلے گئے' کچھ کھر رہ گئے۔ عام لوگوں نے اسلام قبول کر لیا' یہ ان سے بیگانے ہو گئے۔ علیحدہ علیحدہ رہنے لگے۔ جرائم پیشہ کہلانے لگے۔

راجپوتی تاریخ ایک عجیب فخرمندانہ تاریخ ہے۔ پچھلے برس جب جسونت سنگھ کنول کے ساتھ موگے شہر اور آس پاس کے دیہات کی سیر ختم کر کے موٹر میں واپس دہلی آ رہا تھا تو ایک جگہ پر سڑک کے کنارے بہت گوناگوں کاروان نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی بیل گاڑیاں رتھوں کی شکل کی اور پیتل کے ان گنت کوکوں سے مزئین شدہ تھیں۔ ان کا لباس بھی مجھے نہایت کاٹھیاواڑی لگا۔ وہی لال لال شیشوں جڑے جبے' چولیاں' گھگرے۔ مردوں کے لمبے پٹے' بانکی مونچھیں۔ جگہ جگہ آگ کا الاؤ جلائے یہ لوگ لوہا کوٹتے تھے۔

میں موٹر روک کر ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ کون ہیں۔ یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ وہ مہارانا پرتاب سنگھ کے ہم ذات راٹھور تھے۔ جب مہاراجہ پرتاب نے حلف اٹھایا کہ چتوڑ کا قلعہ فتح ہونے تک تھالی میں روٹی نہیں کھائی' چارپائی پر نہیں سونا وغیرہ تو یہی حلف ان کے اڑھائی تین سو ساتھیوں نے بھی اٹھایا تھا۔ یہ بنجارے راٹھور ان سورماؤں کی ہی اولاد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جواہر لال نہرو تک نے انہیں سمجھایا ہے کہ چتوڑ اب آزاد ہے' انہیں واپس اپنے دیس جا کر آباد ہو جانا چاہئے۔ لیکن یہ لوگ نہیں مانے۔ صدیوں سے بھٹک رہے ہیں' بھٹکنا ہی اب ان کی زندگی کی پشت در پشت روایت بن گئی ہے۔ اسے چھوڑنا اب ان کے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

آج سے دو سال پہلے ایک انگریز مصنف جارج بارو نے انگلستان کے جپسی بنجاروں میں رہ کر تحقیق کی تھی کہ یہ لوگ پیچھے سے ملتان کے علاقہ کے ہیں اور کسی وجہ سے دیس چھوڑ کر کئی صدیوں سے دربدر بھٹک رہے ہیں۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے لوگوں نے تحقیق کی اور اب یہ بات جانی مانی ہے کہ انگلینڈ' چین' ہنگری' امریکہ' روس کے علاوہ لاتعداد دیگر دیسوں میں پھیلے جپسی بنجارے دراصل شمالی بھارت کے راجپوت لوگ ہی ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کو "بڑی جگہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انہیں کوئی بھی ہندوستانی مل جائے تو اسے اپنا بھائی سمجھ کر پیار کرتے ہیں۔

عجیب فخر مند لوگ ہوں گے یہ راجپوت۔ ان کی کھشتری صورت مہابھارت کے زمانے میں بنی تھی۔ اسے بدلنے پر وہ غیر قادر تھے' اسی لئے مسلمان حملہ آوروں کے سامنے نہ ٹک سکے۔ اسلامی حملوں کے وقت تک یہی روایات ان کے پاؤں کی بیڑی بھی بن چکی تھیں۔ کئی ذاتوں نے ہار کر اسلام قبول کر لیا۔ جو ہار کر بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے' وہ ہمالہ پربت (کوہ ہمالیہ) کے جنگلوں میں جا چھپے' راجستھان اور کاٹھیاوار کے ریگستانوں کی جانب نکل گئے' اور کئی بالکل ہی دیس چھوڑ گئے اور سیلانی جوگیوں والی زندگی اختیار کر لی۔ اب انہیں دنیاوی نعمتوں کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ کھلا آسمان ہی ان کی چھت اور ساری دھرتی ہی ان کا گاؤں تھی۔ یہ بیراگ رانجھے کے جوگی بننے کی طرح اندوہناک بھی تھا' لیکن اس کی تہہ میں اپنشد کا وہ فلسفہ بھی کارفرما تھا جس کے مطابق صرف جسم مرتا ہے' آتما لافانی ہے۔ دنیا اس فلسفے کو قنوطیت کہتی ہے' لیکن اسی فلسفے نے مہابھارت دور میں ارجن اور اورنگزیب کے زمانے میں گورو گوبند سنگھ کے ہاتھ میں شمشیر تھمائی تھی اور اسی فلسفے نے مہاتما گاندھی جیسے "ننگے فقیر" کو انگریز سامراج کی جڑیں اکھیڑنے کے قابل بنا دیا تھا...... ہیر نگر کے سیال بھی ان راجپوت راٹھوں کی اولاد ہیں۔

تانگے سے اتر کر ہم ایک دروازے کے ذریعہ شہر میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ شہر کی پرانی فصیل میں ہے' جس کے اب ٹوٹے پھوٹے آثار ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اندر جا کر کچھ فاصلے پر ہم نے ناتھ کا مندر دیکھا جو ہنوز بڑی اچھی حالت میں تھا۔ اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ رانجھے کا ناتھ پنتھی جوگیوں کا چیلا بننا ضرور تاریخی واقعہ ہو گا۔ اس مندر کے عقب میں سیالوں کا پرانا شیش محل ہے جو اب گر کر دھرتی کے برابر ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں دیواریں اب بھی کھڑی ہیں۔ بلال اور ظفر صاحب نے مجھے ایک دیوار سونگھنے کو کہا۔ پہلے میں نے سوچا کہ مذاق کر رہے ہیں' لیکن جب انہوں نے اصرار کیا تو میں نے دیوار سونگھی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اس میں سے چندن (صندل) کی مہک آ رہی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ محل کی تعمیر کے وقت چھتوں، دروازوں، کھڑکیوں وغیرہ کے لئے صرف چندن کی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ اسی وجہ سے محل ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کے کھنڈرات میں سے چندن کی خوشبو آتی ہے۔ اس دیوار کا نام ہی "چندن دیوار" ہے۔

اس ویران محل کی زمین کے ایک طرف سیالوں کے موجودہ سرکردہ نواب---- بہادر خان کی حویلی ہے۔ بہت بڑے جاگیردار ہیں۔ انہوں نے ہماری بڑی عزت افزائی کی، چائے پلائی، اور سیالوں کی پوری تاریخ سنائی۔ کیسے راجہ بھوج راج کے وقت سیال مسلمان ہوئے۔ کیسے مذہب کی تبدیلی کے باوجود خاندانی رسم و رواج پشت در پشت چلتے آئے، جیسے کہ بیاہ شادی کے وقت برہمنوں پروہتوں کو بلانا، پناہ گزین کی حفاظت، غیر مستقل عزت افزائی وغیرہ۔ کیسے ان کا راج دستور سکھ دور تک قائم و دائم رہا۔ کیسے کھڑک سنگھ نے حملہ کیا۔ کیسے نواب کے سردار نے دغا بازی کی اور سکھوں کے ساتھ مل گیا۔ کیسے تیسرے حملے پر سیالوں کو شکست ہو گئی۔

نواب صاحب کا ایک مزارعہ بھی ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔ اس نے دغاباز سردار کے متعلق پرانے وقتوں سے چلتے آئے مذمت بھرے اشعار سنائے۔ بہت اچھے تھے وہ، میں نے نوٹ کر لئے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ کاغذ مجھ سے کہیں کھو گیا ہے۔ نواب صاحب نے آخر میں کہا "آج کل کے زمانے میں پیسہ دیکھتے ہیں، پہلے خاندان دیکھتے تھے۔ آج کتے کی نسل تو نظر آتی ہے، لیکن انسان کا خون نہیں دکھائی دیتا۔ انگریز بھرتیاں کرتے تھے، خاندان دیکھ کر کہ بھئی بھیڑ لگ گئی تو خاندان کی ناک نہیں کاٹے گا۔ لیکن اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ اب مکان ہو، پیسہ ہو، موٹر ہو، پتلون ہو......."

آج واقعی میرا شاعروں کے قریب ہونے اور تخلیق کے شاعرانہ ساگر میں غوطے لگانے کا دن تھا۔ نواب صاحب کی بیٹھک میں ہی، جھنگ کا پنجابی زبان میں لکھنے والا ایک نوجوان شاعر شارب انصاری بھی آ بیٹھا تھا۔ یہ جھنگ میں پیدا ہوا اور امرتسر میں پلا بڑھا۔ ماجھی بولی بولتا ہے، گورمکھی رسم الخط سے خاصا واقف ہے۔ چائے پیتے وقت اس نے اپنی چھوٹی سی نظم سنائی، جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ اس شاعر کو بانسوں میں جکڑ لوں۔

میں ماجھے دا جٹ
میری دیکھ جوانی چناں
جدھر جاواں پا دیاں بناں

پھلیے جیوں جولے دا کتھاں
گیلیاں ورگے پٹ
میں ماجھے دا جٹ

میں نہیں روندا دکھڑے دس کے
مینوں نہیں کڑیاں دے چسکے
لنگھ جاواں متھا جیھا ہس کے
اکھ ملاواں گھٹ
میں ماجھے دا جٹ

جد کولوں لنگھاں آکڑ کے
جتی چیکے چادر کھڑکے
کئی نیاراں دل نوں پھڑ کے
گندیاں رہ جان پھٹ
میں ماجھے دا جٹ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

8

جھنگ گمیانے کو یاد کرتے وقت بے شمار چہرے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں--- بلال' انجم تقی' ظفر علی' شیری صاحب' شارب انصاری' حبیب' شیر افضل جعفری اور میں سوچ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ کیسے ان خدا کے بندوں نے ایک پردیسی اور ناواقف شخص کو فوراً" گلے سے لگا لیا۔

کبھی ایسے چہرے بھی سامنے آتے ہیں جن سے صرف دور دور سے ہی دوستی لگانے کا موقعہ ملا--- مثلاً" زیل گھر کا ملک پھتیے خان سیال۔ اس کا ہوٹل کے ایک کونے میں میز کرسی بچھا کر بیٹھنا نواب سا معلوم ہوتا--- راج سنگھاسن (مسند اقتدار) اس کے لئے کافی موزوں چیز تھی۔ کوٹھے جتنا قد' ہاتھ لگانے پر میلی ہونے والی گوری رنگت' قیامت کا حسین چہرہ' مردانہ وجاہت' لیکن شرمیلا--- ہوبہو جیسے کسی مغل یا راجپوت مصور نے بنایا ہو۔ دیسی لباس۔ ایک شام کو چپ چاپ میرے کمرے میں چارپائی پہ آ بیٹھا تھا۔ میں نے کہا تھا' "آپ اتنے سوہنے ہو۔ آپ کی تصویر تو میں لازماً" کھینچوں گا۔"

اس کے بعد وہ جب بھی مجھے آتے جاتے دیکھتا کہیں چھپ جاتا۔ تصویر کیا لینی تھی' میں پل بھر اس کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے سے بھی محروم ہو گیا۔

لیکن جس شخصیت کا مجھ پر سب سے گہرا اثر ہوا وہ تھے شیر افضل جعفری--- وہی شاعر جس کے بارے میں میں نے پیچھے کہا ہے کہ کسی بڑے افسر کے خانساماں جیسا نظر آتا تھا۔ یہ انسان مجھے عالمگیر دوستیوں کا مالک معلوم ہوا' اس کے سنگ بیٹھ کر میں نے خود کو دھرتی سے بالشت بھر اونچا محسوس کیا۔

مجھے زندگی میں کچھ عالمگیر ہستیوں کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے--- گاندھی جی' ٹیگور' کشمیری زبان کے عظیم شاعر غلام احمد مہجور' بنگالی ادیب کھتی موہن سین وغیرہ۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس سطح پر یہ لوگ سوچتے ہیں اس کا اندازہ صرف ان کی تحریریں پڑھ کر ہی نہیں بلکہ ان کی بات چیت اور اس میں سے چھلکتے مزاح سے حاصل ہوتا ہے۔ رونے کی نسبت ہنسنا اور رلانے کی نسبت ہنسانا کہیں مشکل کام ہے۔ رونا قنوطی اور احساس زیاں کا مظہر ہے' اس کا قالب دنیاوی لالچ سے منسلک ہے۔ اسی لئے اس کی بھانت بھانت کی مثالیں نہیں اور سطحی راز بھی معلوم ہیں۔ لیکن مزاح میں غیر آلودہ پن' نکتی اور پرواز ہے۔ تبھی اس کے بھانت بھانت کے رنگ ملتے ہیں۔ یہ پست سے پست اور بلند سے بلند سطح تک جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ کسی انسان کی زندگی' جذباتی اور اخلاقی عظمت کا اندازہ بخوبی اس کے ہنسنے سے کیا جا سکتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہنسنا اوپر بیان کردہ عظیم لوگوں کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ اسی سے وہ اپنی تھکاوٹ اتارتے' اپنے کام کو اور جیسے ساری دنیا کو بھی کھیل سی بنا دیتے۔ خیال اور لفظ پر قادر ہونے کے علاوہ ان کے کردار کی بے خوفی اور بے تمنائی ان کے ہنسی مذاق میں چھپی ہوئی معصومیت' راحت اور سکون بھر دیتی۔ ان کی برجستہ گپ شپ میں وہ کرامات پیدا کر دیتی جو ان کی تصنیفات سے بھی کہیں سربلند ہیں۔

شیر افضل بذات خود ایک چلتا پھرتا مشاعرہ ہے۔ اس نے مجھ سے' ملاقات ہونے پر' نہ ہی اس کے بعد کبھی کوئی ذاتی سوال پوچھا--- میں کون ہوں' کہاں سے آیا ہوں' کیا کرتا ہوں' ان باتوں میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی چنچل اور حیران کن حد تک جوان آنکھیں میرے اندر کے انسان کو جھنجوڑتی تھیں۔ میری بڑائی اس بات میں تھی کہ مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر نہیں لگا۔ مجھے ان میں وہی کچھ ملتا جو میں تلاشتا تھا اور میں دل ہی دل میں ڈاکٹر نذیر کی تعریفیں اور تائید کرنے لگا--- "واقعی یہ بڑی مردم خیز دھرتی ہے۔"

اس شام کو جب جھنگ سے واپس آ کر ہم تقی انجم کے گھر جمع ہوئے تو شیر افضل جعفری نے مذاق اور ہنسی کی بوچھاڑ کر دی۔ اسی دوران غیر محسوس طور پر شاعری شروع ہو گئی' مشاعرہ ہونے لگا۔ تقی انجم نے انتہائی المیہ نظمیں شروع کیں' ظفر نے رومانی۔ کل دس پندرہ آدمی بیٹھے تھے۔ لیکن ایسا رسیلا سماں بڑے سے بڑے مشاعروں میں بھی کبھی کبھار ہی بندھتا ہے اور پھر جب میر مشاعرہ شیر افضل نے اپنی غزل سنائی تو ایک ایک شعر آسمانوں پر پرواز کرنے لگا۔ واقعی اگر محمد اقبال وہاں موجود ہوتے تو

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"وان کرو رگ رگ بھر وصلاں، گھٹ گھٹ مارو جپھیاں"

کی نوبت آ جاتی۔

جعفری کو اپنے جھنگ دیس کی بولی پر زبردست مان ہے اور اس کی شاعری میں یہ بولی پنجاب کی سب سے میٹھی اور قابل فہم بولی بن جاتی ہے، لیکن وہ لکھتا اردو میں ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ جذبہ تحقیر نہیں۔ وہ اپنے دیس کی جانی مانی قومی زبان اردو کو مضبوط بنانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اردو کو محدود نہیں وسیع انداز میں دیکھتا ہے، اس کی وضع کو جھنگی الفاظ، استعاروں اور تشبیہات سے بھرتا ہے، جیسے کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے----

"دار کا سوگ سوگ ہلکورا
زندگی کا ساگ لایا ہے
محو آب چناب ہو کر بھی
عشق نے اگ راگ گایا ہے۔
پھر نیا داغ وقت نے بخشا
اک دیا اور مسکرایا ہے۔"

"جھلمل پونگوں" سے چمکی ساعتیں
سرمئی لمحوں کے دھارے بج گئے
کالی کالی خامشی کے کلن میں
شیر افضل کے بلارے بج گئے۔"

"یہ بلھے کا مصرع
یہ باہو کی بانی
حسن اس کا مصریلا
اور قسمت کتھانی
کلجگ میں کملائے
لاج محل کی رانی۔"

وہ یہ نکتے ایسے خوبصورت اور جڑاؤ ڈھنگ سے پیش کرتا ہے کہ بڑے سے بڑے نکتہ چینوں کو بھی برے نہیں لگتے۔ اس انوکھی رنگت نے اس کی شاعری کو بھرپور داد

دلوائی ہے۔ ہندی، اردو میں لکھنے والے دیگر کئی جتندی پنجابی لکھاریوں نے بھی ایسے تجربات کئے ہیں، لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اپنی زبان کے لئے دور دراز سے نئے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لے آنا اچھا اور جائز کام ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے لگ بھگ ساٹھ ہزار نئے الفاظ بنگالی زبان میں ڈال دیئے۔ لیکن بیگانی زبان میں نیا لفظ شامل کرتے وقت لگاتار دائیں بائیں دیکھنا پڑتا ہے، حد درجہ کاریگری درکار ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے میں سوچتا ہوں کہ اگر اپنی بے قابو لیاقت کا استعمال شیر افضل نے اپنی زبان کے لئے کیا ہوتا تو اس کی جادوئی شخصیت کے سامنے نشو و نما کی تمام راہیں کھل جاتیں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر پایا تو قصور اس کا نہیں بلکہ ان حالات کا ہے جنہوں نے بلھے اور وارث کے وارثوں کو اس دور میں عجیب انداز میں بھٹکا کر سٹپٹا دیا ہے۔

اس سے پہلی رات، جھنگ میں میری آخری رات، جب حبیب بینک کے مینجر صاحب کی کوٹھی میں، تاروں کے سائے تلے سمی کا نقارہ بجا تھا تو شیر افضل پھر سے پھلجھڑیوں اور مہتابیوں کے مانند پھوٹ پھوٹ پڑا۔ میں اس کی شخصیت کی مہک کیسے بیان کروں، میری طاقت سے باہر ہے۔ اگر مجھے ڈائری لکھنے کا درست انداز معلوم ہوتا تو اوھر ادھر کی باتیں نوٹ کرنے کی بجائے اس کے منہ سے نکلے ہر جملے کو ہی نوٹ کرتا جاتا۔

پنجاب کا بھنگڑا سارے ملک میں شہرت حاصل کر چکا ہے، لیکن جھنگ کے سمی ناچ کے سامنے وہ کوئی چیز نہیں۔ میرے بیان کی سچائی کو وہی دوست پرکھ سکتے ہیں جنہوں نے یہ ناچ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

دراصل سمی نیاروں کا ناچ ہے۔ اس کی طرز، لے اور تال سبک اور مہین ہے۔ اس میں بھنگڑے جیسی بے ترتیبی بالکل نہیں۔ آج یہ مردوں کے پلے پڑ گیا ہے، تو اس بات کی ذمے داری صرف مسلمانوں کی مذہبی تنگ نظری کے سر نہیں منڈھی جا سکتی۔ پاس ہی بیٹھے ایک بزرگ نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے بچپن میں گاؤں کی عورتیں، ہندو اور مسلمان دونوں، سمی ناچا کرتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ نئے زمانے کے پڑھے لکھوں نے ان چیزوں کو غیر مہذب اور بیہودہ قرار دے دیا اور شہر والیوں کی دیکھا دیکھی جٹیاں بھی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئیں۔

بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں استاد بن کر شانتی نکیتن پہنچا تو وہاں کے بنگالی لڑکے لڑکیوں نے مجھ سے پنجابی لوگ گیتوں کے بارے میں سوال پوچھے اور میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ یہ لوک گیت کیا بلا ہوتے ہیں؟

دیس آزاد ہونے کے بعد ہمارے بھارتی پنجاب میں پنجابی زبان کو خاص عزت ملی۔ ترقی کی راہیں کھل گئی ہیں اور دیگر صوبوں کی دیکھا دیکھی پنجابیوں نے بھی اپنے لوک گیتوں، لوک ناچوں وغیرہ کی قدر کرنا شروع کر دی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس پرانی پیدائشی وضع کے لچھن پوری طرح دور ہو گئے ہیں۔ عزت دار شہری گھرانوں میں کئی مرتبہ ایسی انگریزی یا ہندی لہجے میں لتھڑی پنجابی سننے کو ملتی ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ گلوکار اور موسیقار لوک گیتوں کو اپنی فلمی اور مسخ شدہ ادا سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی خوبصورتی اور موسیقیت تباہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے کئی ادیب، چاہے وہ ترقی پسند ہوں یا قدامت پسند، پنجابی ادب اور تہذیب کی خاص نجوں کو چھوڑ کر لکھتے ہیں، جیسے دل کے کسی گوشے میں پنجابی ہونے کی شرمندگی ابھی تک موجود ہو۔ اس قسم کی ماورانہ خدمت کو تو کبھی کبھی نافرمانی کہنے کو جی چاہتا ہے۔

دوسری جانب، پاکستانی پنجاب میں، پنجابی زبان اور عوامی فن کو یتیم بچے کی طرح خوار ہونے کے لئے بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ نہ حکومت نے اسے تسلیم کیا ہے اور نہ ہی معاشرے کی جانب سے اس کی بہتری کے لئے کوئی اقدامات کئے گئے ہیں۔ اس بات کو دیکھ کر قدرتی طور پر دل کو بہت دکھ ہوتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ ایک بات تسلی بھی دیتی ہے، وہ یہ کہ تہذیبی ورثے کو اگر نکھارا نہیں تو کم از کم بگاڑا بھی نہیں جا رہا۔ پاکستانی فلموں میں اور ریڈیو پر مستعمل پنجابی بولی کھری اور خالص ہوتی ہے، دل کو راحت دیتی ہے اور اسی طرح لوک گیت گانے اور لوک ناچ ناچنے کا انداز بھی خالص اور خوبصورت ہے۔ اس کی ٹانگ بازو نہیں توڑی جاتی۔

مردوں کا زنانہ انداز میں ناچنا سننے میں غیر فطری بات لگتی ہے، لیکن دیکھنے میں اتنی غیر فطری نہیں رہتی بشرطیکہ فنکار ہنر مند ہوں۔ آج سے کچھ عشرے پہلے، جب مہاراشٹر میں عورتوں کا سٹیج پر آنا ممنوع تھا، بال گندھرو نامی رقاص ہمیشہ عورت کا کردار ادا کرتے تھے اور ان کی عوامی قبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے ان کے کئے ہوئے فیشن مہاراشٹری عورتوں میں عام ہو جاتے تھے۔

جھنگ کے سی ناچنے والے بھی نہایت اعلیٰ درجے کے فنکار ہیں۔ انہوں نے پشت در پشت اس ناچ کو سنبھالا ہے، کسی بھی اعتبار سے آنچ نہیں آنے دی۔ انہی دنوں شہر میں بیاہوں شادیوں کی بھرمار تھی، اس لئے انہیں سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکن پھر بھی پردیسی مہمان کی فرمائش پوری کرنے کے لئے انہوں نے دیگر تمام فرمائشوں کو بالائے

طاق رکھ دیا۔ گلزار کو دو گھنٹے کے لئے آنے کا وعدہ دے دیا، لیکن میرا جی نہ بھرتے دیکھ کر آدھی رات یہیں گزار دی۔ وہ لوگ بھی، جو منڈلی کو اگلی جگہ لے جانے کی خواہش لئے ہوئے تھے اس مظاہرے کو خوش دلی سے دیکھتے رہے۔

کوئی بارہ افراد کی منڈلی تھی۔ سرخ رنگ کی پگیں، سفید ریشم کے پنڈلیوں تک لمبے کرتے، سرخ تہمدیں۔ ایک دو کے ہاتھ میں چمٹے اور ہاتھوں کے پاس کھڑتالیں۔ جس جوان نے بالخصوص عورت ناچ کرنا تھا وہ عین درمیان میں تھا۔ سلفے کی لاٹ جیسا سبک، معصوم اور خوبصورت۔ ڈھولک والے کی تھاپ پر چمٹے اور کھڑتالیں بجتیں اور بجلی کی رفتار سے یہ لوگ الگ ہوتے، نزدیک جاتے اور پھر فوراً" قطار میں دائرہ بنا کر، زمین کو پیروں کے انگوٹھوں سے ٹھوکتے ہوئے یوں حرکت کرتے جیسے کسی پہیوں والی گاڑی پر سوار ہوں۔ ڈھولک والا اپنے ہاتھوں میں نظر نہ آنے والی تالوں کا ایک سمندر سمیٹے کھڑا تھا۔ نہ وہ زیادہ چلتا اور نہ ہی اس کے منہ پر کسی جذبے کا کوئی شائبہ تھا۔ اس کا چہرہ یوں سپاٹ تھا جیسے کسی آنکھوں والے مردہ کا ہو۔ اس کی تمام تر روح اس کے ڈھول میں تھی۔

رقص گاہ کے اردگرد، کافی جگہ چھوڑ کر، صوفوں اور کرسیوں کی قطاریں تھیں۔ سینکڑوں چھوٹے بڑے، امیر غریب، ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ بہنیں مائیں، اوپر کوٹھی کے برآمدے میں، چقوں کے پیچھے چھپ کر دیکھ رہی تھیں۔ جس مہمان کی خاطر اس قدر خصوصی انتظام کیا گیا وہ خالی جیب تھا۔ یہ خامی دور کرنے کے لئے ہر جانب سے دوستوں یاروں کے نام پر ویلیں دی جا رہی تھیں، فنکاروں کی جھولی کو جی بھر کے بھرا جا رہا تھا۔ مرکزی رقاص گیت گاتے گاتے تھک جاتا تھا۔ اور اس سارے شوق ملہار کی روح رواں گلزار اور شیر افضل جعفری تھے۔

میرا جی چاہا کہ کم از کم دس روپے کی ایک ویل شیر افضل جعفری کے نام پر ہی دے ڈالوں۔ لیکن نوٹ ہیرو کو پکڑاتے ہوئے منہ سے نکل گیا "پاکستان کے گویوں کی ویل" اور جب اس نے نشر کیا تو ہر جانب تالیاں بج اٹھیں۔

آخر کار، شیر افضل نے میری شان میں تقریر کی۔ لیکن مجھے اس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ صبح چھ بجے میں نے سرگودھا روانہ ہونا تھا۔ میں ان لوگوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت کیسے مانگوں گا، جو کل تک میرے لئے اجنبی تھے اور اب سگے بھائیوں جیسے عزیز ہو گئے تھے؟ گلزار، تقی انجم، شارب، بلال، ان سب کو کیسے "خدا حافظ" کہہ سکوں گا! میں ان سوچوں میں غرق تھا۔

لیکن پھر مجھے بھی بولنا پڑا۔ میں زندگی بھر شاید ہی کبھی اس قدر دل کی گہرائیوں سے اور بے تک بولا ہوں گا۔ نجانے کس جذبے نے مجھ سے کہلوایا:

"بھائیو! میں تو آندھی طوفان میں اڑتے ردی کاغذ کی طرح آپ کے شہر کی سڑکوں پر آگرا تھا۔ آپ نے اٹھالیا' صاف سنوار لیا اور اس پہ الفاظ لکھنے شروع کر دیئے۔ اتنا وزن دار کر دیا اسے الفاظ لکھ لکھ کر! اس کاغذ نے تو اڑ کر پھر آگے جانا ہے۔ اب یہ کیسے اڑ سکے گا' بتائیں تو سہی؟......."

اور جب زیل گھر کے سامنے گھپ اندھیرے میں آخری جپھیاں ڈالی گئیں تو شیرافضل نے اپنے قہقہے سے فضا کو درخشاں کرتے ہوئے کہا' "آج ہمیں یقین ہو گیا کہ ہندوؤں میں بھی مومن موجود ہیں!"

پتہ نہیں دل کی کن رنجشوں اور تلخیوں نے اسے یہ جملہ کہنے پر مجبور کیا؟ کیا اس نے رشک کیا تھا؟ کہیں وہ مجھے غلط انداز سے تو نہیں دیکھتا رہا؟ کیا میں اس پر غور کروں' یا خود پر؟

میں کافی دیر تک بستر پہ لیٹا یہی بات سوچتا رہا.........

9

کافی دیر سے' کوئی دوپہر اڑھائی بجے سرگودھا پہنچے' کیونکہ روانگی سے قبل صبح ڈپٹی کمشنر صاحب کے بنگلے پر ناشتے کے لئے جانا پڑا تھا۔ وہ خود ابھی واپس تشریف نہیں لائے تھے' لیکن ان کے اہل خانہ کا بہت اصرار تھا۔ جھنگ کے لوگوں نے پہلے ہی کھلا کھلا کر دنبا بنا دیا تھا' یہ ناشتہ بھی لنچ یا ڈنر سے کم نہیں تھا۔

ان کے اہل خانہ میں سے ایک نوجوان سرگودھا تک بس میں میرے ساتھ چلنے کو بضد تھا۔ میں سرگودھا سے بالکل ناواقف تھا۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ مجھے پھر کوتوالی اور سکیورٹی آفیسر میں پریشان ہونا پڑے۔ یہ بات مجھے بھی جچ گئی۔

سرگودھا میں چنڈی گڑھ کی طرح محلوں کی بجائے سیکٹر ہیں۔ پہلے تو میں نے سوچا یہ نئی ایجاد ہو گی' لیکن پھر معلوم ہوا کہ انگریز دور سے ہی ایسا چلا آ رہا ہے۔

میرے ساتھی' جس کا زبردست نام سکندر حیات خان تھا' کا گھر اٹھارہ نمبر سیکٹر کی ایک گلی میں واقع تھا۔ اس کا اصلی وطن تھا دہلی۔ پٹھان قومیت کا تھا اور کسی زمانے میں کابل سے جلا وطن ہو کر دہلی آباد ہو گیا تھا۔ وہاں اسے انگریز سرکار نے جاگیر دی ہوئی تھی۔ مہاجر بن کر پاکستان آنے پر بھی اسے اچھا خاصا معاوضہ ملا۔ لائلپور' لاہور' سرگودھا' راولپنڈی' سب جگہوں پر اب ان کے گھر اور کاروبار ہیں۔ راستے میں سکندر نے بس کی کھڑکی میں سے مجھے وہ زمینیں بھی دکھائیں جو انہیں الاٹ ہوئی تھیں اور جن کی دیکھ بھال اس کے اپنے ذمہ تھی۔ سکندر پنجابی بولتا ہے' لیکن ابھی زیادہ اچھی نہیں۔ اردو اچھی خاصی دہلی والی بولتا ہے۔ اب میں اپنے باپ دادا کی جنم بھومی میں داخل ہو رہا تھا۔ چاہتا تھا یہاں کی بولی ہی میرے کانوں میں پڑے۔ میرے کہنے پر بیچارہ پنجابی بولنے لگا' لیکن ایسے بھی مسئلہ حل نہ ہوا۔ آخر ایک اچھے فرمانبردار آدمی کی طرح اس نے چپ سادھ لی۔ اس نے دیکھا کہ میرے کان پیچھے بیٹھی سواریوں کی گفتگو سننے میں مگن ہیں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اسی میل لمبے سفر کے دوران میری آنکھیں اردگرد میں ترقی کی علامات بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔ مشرقی پنجاب کی دھرتی پر کہیں نہ کہیں ٹریکٹر ضرور نظر آجاتے ہیں۔ ٹرکوں کا گھمسان ہوتا ہے' چھوٹے بڑے کارخانے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ لیکن جھنگ سے سرگودھا جاتے ہوئے مجھے ایسے آثار نظر نہ آئے۔ ہاں' جٹوں کی ظاہری صورت مشرقی پنجاب کے جٹوں کے مقابلے میں مجھے کوئی بری نہیں نظر آئی۔

اس گلی میں سکندر کا گھر تھا' تقریباً ساری کی ساری پر دلی والوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ کھرے میں منہ ہاتھ دھوتے اور بیٹھک میں روٹی ٹکر کھاتے ہوئے میں ان اڑ چکے پنچھیوں کے بارے میں سوچنے لگا جنہوں نے کبھی یہ گھونسلہ اپنے لئے بنایا تھا۔ کیا بیتی ان کے ساتھ؟ اب کس جگہ اترے ہوں گے وہ؟ کیا ان کے بارے میں سکندر سے پوچھ گچھ کرنا مناسب ہو گا؟ ان لڑکوں کو کیا پتہ؟ جب یہ بھگوڑے بن کر آئے ہوں گے—— وہ بھگوڑے کبھی کے لاپتہ ہو چکے ہوں گے۔ کیا فائدہ ان باتوں کو چھیڑنے سے؟ لیکن لاش کو چاہے کتنا ہی گہرا دفن کر دیں' بو تو تھوڑی بہت آتی رہتی ہے۔

سکندر کی مدد سے پولیس اور سکیورٹی کی حاضری بلا تکلیف اور جھٹ پٹ ہو گئی' لیکن ماننا پڑے گا کہ یہ' قواعد کہہ لیں یا چاہے کھیل' سرگودھا میں میرا بڑا مشغلہ بنی رہی۔ کل بھیرہ روانہ ہونے سے پہلے پھر تھانے جاکر رخصتی کی مہر لگوانا ہو گی' بھیرہ کے تھانے میں آمد کی' اور وہاں سے روانہ ہوتے وقت روانگی کی مہر لگوائی۔ دوپہر کو تین بجے سے پہلے پہلے سرگودھا واپس پہنچنا ہو گا' ورنہ سکیورٹی آفس بند ہو جائے گا اور پرسوں صبح چھ بجے کی گاڑی سے راولپنڈی روانہ ہونا دشوار ہو جائے گا۔

میں نے اپنے گھر میں کئی مرتبہ ذکر سنا تھا کہ ہمارے کئی رشتہ دار سرگودھا میں یا آس پاس کے گاؤں میں اب بھی آباد ہیں۔ ان میں سے کچھ مسلمان ہو گئے اور کچھ ابھی تک ہندو ہیں۔ لائلپور سے جھنگ آتے ہوئے' مہر زوبے خان کی تصویر لیتے وقت' ایک جٹ نے سرگودھا کے موہن لال ساہنی وکیل کا نام لیا تھا۔ شام کے وقت سکندر اور میں ان کا پتہ لگانے نکل پڑے۔ بڑے بازار میں گھستے ہی میں نے "ساہنی کلاتھ ہاؤس" کا بورڈ پڑھا اور فوراً دکان میں گھس گیا۔ لیکن یہ لوگ بھیرہ کے نہیں گجرانوالہ کے ساہنی تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ لیکن ایک بات انہوں نے بہت اچھی بتائی وہ یہ کہ وکیل موہن لال صاحب خالص بھیروچی ہیں اور ان کا گھر نزدیک ہی ہے۔

گھر تلاش کرنے میں ہمیں مشکل نہ ہوئی۔ شری موہن لال ساہنی شہر کے پرانے اور

معزز وکیلوں میں سے ایک ہیں اور شاید بلدیہ کے ممبر بھی۔ بڑا عالیشان مکان تھا ان کا۔ سکندر اور میں بڑے ادب سے ان کے دفتر میں داخل ہوئے۔

کوئی ساٹھ برس کے وکیل ہوں گے وہ۔ وکیلوں والا کالر اور کالا کوٹ ابھی تک پہن رکھا تھا' جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچہری سے واپس آتے ہی وہ پھر کام میں مگن ہو گئے تھے۔ میز کے اردگرد کی دوسری کرسیوں پر کارندے اور موکل بیٹھے تھے' جن کا لباس دیہاتی تھا۔ ہمارے ساہنی خاندان نے بڑی بھاری تعداد میں وکیل اور جج پیدا کئے ہیں۔ اس دفتر کا نظارہ کئی پرانی یادیں کرید کر تازہ کرنے لگا۔

میں نے نمستے کر کے کہا' "میں بمبئی سے آیا ہوں جی اور میں بھی ایک ساہنی......"

آگے سے انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا' "بیٹھیں۔"

وہ عینک اتار کر بڑی دیر تک میری جانب گھورتے رہے۔ پھر جیسے بڑی مشکل سے کہنے لگے—— "تم...... بلراج ہو؟......"

میرا روم روم کانپ اٹھا۔ جی چاہا اٹھ کر انہیں گلے سے لگا لوں' لیکن ابھی رشتہ شناخت نہیں ہوا تھا' جرات کیسے ہوتی؟

"پتہ ہے میں تیرا کیا لگتا ہوں؟" انہوں نے پھر کہا۔

"نہیں جی" میں نے بے حد شرمسار ہو کر کہا' "کچھ سال پہلے میرے ماں باپ بمبئی آکر ٹھہرے تھے۔ کئی مرتبہ آپس میں بھیرے اور سرگودھا کے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کا ذکر کرتے' لیکن میں نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے خود کبھی سرگودھا آنے کا موقعہ ملے گا' اس بات کا سپنے میں بھی گمان نہیں ہوا تھا۔"

"تیری تائی ہے نا' لکھمیں؟"

"جی۔"

"وہ میری ماسی (خالہ) لگتی ہے......"

بچپن میں جب ہم پنڈی سے کشمیر جاتے تھے تو لوئر یہ سے آگے سڑک کی دائیں جانب' پہاڑ کے ساتھ ساتھ ایک لکڑی کی باڑ سی نظر آتی۔ مورے کے بجلی گھر کی نہر تھی یہ۔ اور میرے پتا جی اس کی طرف اشارہ کر کے ہمیں بتاتے "یہ تمہارے تایا جی نے بنوائی تھی' شیو داس بھایا جی نے۔ ان کا یہاں ٹھیکہ تھا۔"

تایا جی نے میرے والد کو بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ میری پیدائش سے بہت برس پہلے سے وہ سورگ باسی ہو چکے تھے۔ میرے بہن بھائیوں میں سے بھی کسی نے انہیں نہیں دیکھا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تھا' لیکن تائی جان کو اچھی طرح سے جانتے اور دیکھا ہوا تھا۔ کئی مرتبہ ہمارے پاس پنڈی آ کر رہتی تھیں' اور بہت ہی پیار کرتی تھیں۔ ویسے بال ودھوا (چھوٹی عمر میں بیوہ) ہو جانے کے بعد وہ زیادہ تر اپنے میکے گھر میں ہی رہا کرتیں' کبھی سرگودھا' کبھی بھیرہ اور کبھی کیمبل پور۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ سرگودھا ہی رہیں اور وہیں وفات پائی۔ میں نے کبھی بھی ان کی کوئی خدمت نہیں کی تھی۔ انگریزی تعلیم کے صدقے میں ہوش سنبھالتے ہی انتہائی خودپرست ہو گیا تھا۔ پنڈی سے بھاگے ہوئے بھی تو یگ بیت چکا تھا۔ اپنی نالائقیاں یاد کر کے دل بہت دکھی ہوا۔ سر شرم سے جھکتا جا رہا تھا۔

وہ ہنس کر کہنے لگے----

"سن بھئی سیانے' تمہاری یہاں جو جائیداد تھی وہ تم لوگوں نے کلیم کیوں نہ کی؟"

"یہاں ہماری کون سی جائیداد تھی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تیرے تایا جی کا ایک مکان تھا۔ ان کی موت کے بعد تیرے باپ نے اسے مسمار کرا کے دکانیں بنوا دی تھیں۔ ان کا کرایہ تیری تائی جی کو ملتا رہتا تھا' لیکن ان کے بعد تو وارث تمہی لوگ تھے۔ تم نے کلیم کیوں نہ کیا؟ میں نے تیرے باپ کو چٹھیاں بھی بھیجیں' لیکن انہوں نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔"

"مجھے تو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ پتا جی نے کبھی میرے ساتھ ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ چلیں' دو تین دکانیں کلیم نہ کیں تو کیا ہوا؟"

"پتہ ہے تقسیم کے وقت ان دکانوں کی کیا قیمت تھی؟ کم از کم تین لاکھ!"

یہ سن کر میں چونک گیا۔ کیا اس انجانے شہر میں جسے کبھی میں نے دیکھا بھی نہیں' میری لاکھوں روپے کی جائیداد تھی؟ میں نے یکدم خود کو بڑا امیر اور سرگودھیا محسوس کیا۔ اب تک میں نے سرگودھا شہر کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اسے محض ایک گاؤں یا قصبے جیسا تصور کیا۔ ساتھ' راولپنڈی میں پلا بڑھا ہونے کی وجہ سے' ہم بھروچی لہجے کا ہمیشہ تمسخر اڑاتے تھے۔ اس لہجے کے مطابق لفظ سرگودھا کا "گودھ" بہت واضح ہو کر کان میں پڑتا اور ہمارے لئے یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ اس نام کا شہر بڑا یا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے! اب تک یہی خیال دل میں بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ نے خود ہی کلیم کیوں نہ کر دیا' بھاپا جی؟" میں نے پوچھا۔

"چیز تمہاری' ہم کیسے کلیم کر سکتے تھے؟"

یہ سابنیوں والی سچی اور کھری بات تھی۔ ورنہ اس ہلچل اور افراتفری کے وقت

برحق اپنی ایک خاندانی چیز کو سنبھال لینا ان جیسے ممتاز انسان کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ لیکن پتا جی اگر کلیم کرتے بھی تو بھارتی حکومت کی طرف سے پچیس تیس ہزار سے زیادہ نہ ملتا۔ لیکن ان یہاں موجود لوگوں کے لئے اس وقت یہ تین لاکھ کی چیز اب چھ لاکھ کی ہوتی=

"مہاراج تو یہاں ہمارے پاس آ کر کیوں نہیں ٹھہرا؟ جس دن ہم نے اخبار میں پڑھا کہ تو آیا ہوا ہے' ہمیں تب سے پکی امید تھی کہ ہمارے پاس کچھ دن آ کر ضرور رہے گا۔ ہم تو اڑوس پڑوس میں بتاتے پھر رہے تھے۔"

"مجھے خیال نہیں تھا' بھاپا جی' کہ یہاں میرا اپنا گھر ہے۔ اب تو بس کل کا دن بھیرے' پھر واپس آ کر پرسوں پنڈی چلا جاؤں گا۔"

"بھیرے کس کے پاس جانا ہے؟"

"کس کے پاس جانا ہے؟ اب وہاں کون ہے ہمارا؟"

"بھیرے میں تو اب اپنا بھی کوئی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"خود جا کر دیکھ لینا۔ لیکن وہاں ہمارا ایک ساہنی بھائی تو ہے---- اب چودھری غلام محمد ہے اس کا نام۔ سابنیوں کے محلے جائے گا نا' تو پوچھ لینا۔ تمہارے گھر کے ساتھ ہی اس کا گھر ہے اور دیکھ' اب تو تو ان کے ساتھ آیا ہے میں کچھ نہیں کہتا لیکن کل رات کو روٹی ہمارے ساتھ کھانا۔"

"ضرور جی۔"

سکندر نے انہیں اپنا تعارف کروایا۔ وہ اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بہت خوش ہوئے کہ میں اچھے لوگوں کے پاس ٹھہرا ہوں.......

16 اکتوبر' 1962ء

صبح اٹھتے ہی پہلے تھانے میں رپورٹ درج کروائی' پھر بسوں کے اڈے پر جا پہنچے۔ بھیرہ بھی ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر تھا۔ سکندر ہمراہ تھا' بلکہ دو مزید دوست بھی تیار ہو گئے تھے۔ اس وقت میں نے ان کے ساتھ کو ان مول خیال کیا۔ بھیرہ پہنچ کر مجھ پر جذبات کا کیا طوفان ٹوٹا تھا' اس وقت مجھے علم نہ تھا' اس وقت بھیرہ مجھے آسان سی مہم لگ رہا تھا!

بسوں کے اڈے کا ماحول..... بڑے گندے گندے بھکاری بسوں کے اندر آ آ کر

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

بھیک مانگ رہے تھے۔ ہندوستان کے دیگر حصوں کا تو مجھے علم نہیں، لیکن پنجاب کے شہروں میں ایسی بے قاعدگی ناممکن ہے۔ بھکاریوں کو بس کے اندر گھس کر مسافروں کو پریشان کرنے کی آزادی نہیں مل سکتی اور یہ بھکاری بھی مجھے اصلی معنوں میں محتاج نہیں لگ رہے تھے، حکومت پر عوام کی مذہبی رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے نظر آتے تھے۔

بس بھیرہ کی طرف بھاگتی جا رہی تھی، لیکن مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں تھوڑی دیر میں واقعی بھیرے پہنچ جاؤں گا۔ پچھلی مرتبہ جب بھیرہ دیکھا تھا، چالیس برس پرانی بات ہے۔ اس وقت میری عمر بمشکل آٹھ نو برس ہو گی۔ تب پنڈی میں طاعون کی وباء پھیلی ہوئی تھی۔ ماتا جی کو جھاڑو دیتے ہوئے کمرے میں ایک بڑا سا چوہا نظر آیا۔ اسی شام کو پتا جی گھر والوں کو گاڑی میں بٹھا کر بھیرے چھوڑ آئے۔ ہم کوئی چھ ماہ بھیرے میں رہے تھے۔ اسی دوران میری بڑی بہن جی، جو اب اس دنیا میں نہیں، کی منگنی ہوئی، بیاہ ہوا۔ یہ چھ ماہ بڑے پرلطف تھے۔ سکول کم و بیش ہی جاتے تھے۔ پتا جی پنڈی تھے، ماں چاہے کتنی ہی سختی کرے لیکن اس کی پرورش میں نرمی ہوتی ہے، عجیب سی گرمائش اور مزہ ہوتا ہے۔ بھیرہ چھوٹا سا شہر تھا،

بھیرے کی ایک گلی جو کبھی یاد سے محو نہ ہوئی

اس کی گلی گلی اور چپے چپے کو چھان مارا۔ کھوکھران برادری والوں کے اپنے الگ الگ محلے تھے، ساہنیوں کا محلہ، انندوں کا، کوہلیوں کا، وغیرہ۔ پتہ نہیں یہ محلے کب اور کیسے بنے؟ ہر محلے کا اپنا دروازہ ہوتا تھا۔ میری بہن کی شادی کے وقت چچا زاد، ماموں زاد بھائی ڈولی اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس دروازے تک لے گئے اور وہاں سے سسرال کے حوالے کر کے واپس لوٹ آئے تھے۔ اس وقت مجھے اپنی بہن پر بہت ترس آیا تھا۔ وہ ڈولی میں تن تنہا بیٹھی بیچاری کتنا گھبرا رہی ہو گی۔ ڈولی روانہ ہوتے وقت سبھی کو روتے دیکھ کر میں بھی رو دیا تھا۔ مجھے رونے کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ میں اتنا رویا کہ لوگوں کے لئے چپ کروانا مشکل ہو گیا۔ لیکن جب ڈولی چلی گئی اور پیسوں کی بارش شروع ہوئی تو میں گلی کے دوسرے لڑکوں کی طرح زمین سے پیسے اٹھانے لگا۔

میری تائی جی کچھ محلہ دار عورتوں کے ساتھ صبح منہ اندھیرے دریائے جہلم پر سردیوں گرمیوں میں اشنان کرنے جاتی تھیں۔ کبھی کبھی میں اور میرا چھوٹا بھائی بھیشم (بھیشم ساہنی، جو ہندی کا مشہور افسانہ نگار ہے) ساتھ چل دیتے۔ پہلا پڑاؤ چڑی چوگ، دوسرا گھڑی بھن اور تیسرا دریا پر ہوتا، جو کبھی دور چلا جاتا اور کبھی نزدیک آ جاتا۔

واپسی پر وہ ماتھا ٹیکنے گوردوارے جاتیں۔ کڑاہ پرشاد کا انتظار بہت مزیدار ہوتا تھا۔ کوئی کوئی ساکھی (بول) بھی پلے پڑ جاتا۔ میں حیران ہو کر سوچتا، راگی اندھا کیوں؟ "بور" بھی نہیں ہوتا تھا۔

چڑی چوگ کے نزدیک ایک میدان میں انوکھا میلہ لگتا تھا۔ سارے شہر کی کڑیاں چڑیاں یہاں اکٹھی ہوتیں، پلہ اور بین ڈالنا سیکھتیں۔ کبھی کبھی رات کو ہمارے نچلے صحن میں ترنجن لگتا، میری دونوں بہنیں سہیلیوں کے ساتھ، ماتا جی کی تیز نظر نگرانی میں ساری ساری رات چرخا کاتا کرتیں۔ ایک رات کسی لڑکی نے جھوٹ موٹ باہر جا کر "چور چور" کا شور مچا دیا تھا، سارا محلہ ڈانگیں سوٹے اٹھا کر دوڑ پڑا۔

تب تورا نامی ایک ڈاکو کا بہت خوف تھا، کہ یہ رسی کے ذریعہ کوٹھوں پہ چڑھ جاتا تھا۔ شام کو ایک میدان میں، جہاں ان گنت لکڑیاں پڑی تھیں، ہمارے محلے کا تیلی، ڈاکوؤں اور چڑیلوں کے عجیب عجیب قصے سناتا تھا۔ لڑکے فوراً ڈوڈوں اور بنٹوں کی کھیلیں چھوڑ کر اس کی باتیں سننے جمع ہو جاتے۔

سماجی زندگی لاتعداد پشتوں تک پسماندہ تھی۔ کبھی کبھی گشتی سینما گھر آتے، قناتیں لگا کر کھیل دکھاتے۔ یہ فلمیں وہ ہوتی تھیں جنہیں بلیو فلم کہا جاتا ہے۔ ایک فلم میں، جسے

بے ضرر قرار دے کر ہمارے سکول کے سارے بچوں کو دکھایا گیا تھا' ہیروئن شروع سے آخر تک الف ننگی تھی۔ ترجمان' جو پردے کے پاس ایک مچان پہ کھڑا ہو کر فلم کی کہانی سنایا کرتا تھا (اس وقت فلمیں خاموش ہوتی تھیں) ہمارے ماسٹروں کو چپ کرانے کے لئے کہنے لگا۔۔۔ "صاحبان' یہ ننگی نہیں ہے۔ اس نے جادو کی پوشاک پہن رکھی ہے۔"

ایک رات ہمارے گھر کا نوکر مجھے ساتھ لے کر گھر سے چل دیا۔ سینما کی قنات سے دور ایک درخت پر خود بھی چڑھ گیا اور مجھے بھی چڑھا لیا۔ پردے پر جو سین چل رہا تھا' بھیانک حد تک لچر اور ناپاک تھا۔ مرد عورت کے جنسی رشتے کو حیوانیت سے بھی نچلی سطح تک گرا کر دکھایا جا رہا تھا۔ میں گھبرا کر درخت سے نیچے اتر آیا' اور نوکر کو بھی چیخ چیخ کر نیچے اترنے کو کہنے لگا۔ آخر مجبوراً اسے نیچے اترنا ہی پڑا۔

اس قسم کے گھناؤنے کھیل سینما گھروں والے پنڈی یا لاہور جیسے بڑے شہروں میں دکھانے کی جرات نہیں کر سکتے تھے' لیکن چھوٹے قصبات میں عوام کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی کرنا آسان کام تھا۔ دیس کی زیادہ تر آبادی دیہات اور قصبات میں رہتی تھی۔ اسے دن بدن جہالت' بدی اور بربریت کی کھائی میں گرائے رکھنا بدیسی حکومت' اس کے گرگوں اور پیسے کے پجاریوں کے لئے نہایت سود مند تھا۔

کبھی کبھی افواہیں اڑتیں کہ فلاں فلاں دھوبن' فلاں چوہڑی اپنے یار کے ساتھ فلاں باغ میں گئی ہوئی ہے۔ ہجوم کا ہجوم پتھر اینٹیں اٹھا کر انہیں ڈھونڈنے اور سبق سکھانے کے لئے چل پڑتا۔ ہر دوسرے چوتھے دن گلی محلے میں کوئی خوف طاری ہو جاتا اور ماں ہمیں چھپا کر اندر بند کر دیتی۔ تاریک گلیاں' تاریک کمرے' سالہا سال کے سوگ مناتی ہوئی عورتوں کے میلے کچیلے دوپٹے' دشمنیاں' عداوتیں' اندھا اعتقاد' ناانصافی' ظلم.........

عوام کی روح اس پسماندگی کے خلاف بغاوت بھی ضرور کرتی ہو گی۔ ایک مرتبہ گنج منڈی کے کھلے میدان میں ڈاکٹر کچلو کا لیکچر ہوا تھا۔ شاید سارا شہر ہی جمع ہو گیا تھا وہاں۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اتنی بھیڑ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ڈاکٹر کچلو کے ایک ساتھی کو' جس نے کالا کوٹ پہنا ہوا تھا' پولیس نے تقریر کے دوران ہی گرفتار کر لیا تھا' اور ہوں کی دیکھا دیکھی ہم چھوٹے بھی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے اپنے گھروں کی جانب دوڑ لئے اور پیچھے سے کتنی دیر تک طرح طرح کے ترانے اور نعرے سنائی دیتے رہے تھے:

"خدایا کیسی مصیبتوں میں یہ ہند والے پڑے ہوئے ہیں..."

"بولی اماں محمد علی کی........"

"سرکاری نوکری شرعاً" حرام ہے......"

تصور کے پردے پر کتنی ہی تصویریں منعکس ہو گئیں: گندم کے ہرے بھرے کھیت' جن میں چھپن چھپائی (لکن میٹی) کھیلتے تھے' جن کے پودے توڑ کر تونتیاں بناتے تھے' سٹے توڑ کر شرارت سے راہگیروں کی شلواروں کے پانچوں میں گھسیڑ دیتے تھے۔ کنوؤں کے پانی' کھیتوں میں سے تازہ تازہ توڑی ہوئی مولیاں اور گاجریں..... اس زمانے کے بعد کبھی بھی تو میں نے دوبارہ دیہی زندگی کا لطف نہیں اٹھایا۔

ساتھ والی سیٹ پر ایک بوڑھی عورت اپنے بیٹے کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری اپنی ماں آ بیٹھی ہو۔ وہی لباس' وہی بولی...... میرے اپنے...... بالکل میرے اپنے لوگ...... کیا بتاؤں میرے من کی حالت کیا ہو گئی؟

بس بھلو وال کے اڈے پر رکی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ بھلوال بھیرے سے کل دس بارہ میل دور ہے۔ بچپن میں ہم گاتے پھرتے تھے:

"گڈی آئی گڈی آئی بھلو وال دی
بڈھڑے دی داڑھی وچ اگ بالدی!"

ڈرائیور نے بتایا کہ بس یہاں پون گھنٹہ کھڑی رہے گی۔ کل تین گھنٹے ہی تو رہ گئے تھے میرے پاس بھیرہ دیکھنے کے لئے' اس میں سے بھی پون گھنٹہ یہاں ضائع ہو جائے گا۔

اپنے ساتھیوں سے پوچھے بغیر میں سیدھا اڈے کے منتظم کے پاس گیا' جو عمارت کے برآمدے میں کرسی بچھائے حساب کتاب کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کیسے میں چالیس برس بعد صرف تین گھنٹے کے لئے وطن دیکھنے کے قابل ہوا ہوں اور کیسے میرے لئے اڈے پر پون گھنٹہ گزارنا ناقابل برداشت ہے۔ اس آدمی نے بھی وہی بات کہی جو کل موہن لال جی نے کہی تھی' "لیکن بھیرے میں اب ہے کیا جسے دیکھنے جا رہے ہو؟"

میرے منہ سے نکلا' "کیا کروں جی' مٹی کھینچ لائی ہے۔"

وہ لاجواب سا ہو کر میری جانب دیکھنے لگا۔ پتلون کوٹ والے آدمی کے منہ سے اسے ایسا جملہ سننے کی امید نہ تھی شاید! اس نے پندرہ منٹ کے اندر اندر بس روانہ کر دی۔

بھیرے کے آس پاس کا علاقہ مجھے کیا یاد ہونا تھا' لیکن وہ اس قدر سرسبز اور اتنا پررونق ہو گا' اس کا تصور نہیں تھا۔ جھنگ یا سرگودھا اس کے مقابلے میں ویران علاقے ہیں۔

ریلوے سٹیشن سے اتر کر بھیرے آئیں تو سابنیوں کا محلہ سب سے پہلے آتا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہے۔ لیکن بسوں کا اڈہ شہر کے پچھلے دروازے پر بنا ہے' جس کو شاید ہم بلوچی دروازہ کہتے تھے۔ اس سے باہر جاتے ہوئے ڈرتے تھے' جیسے اس کے پار کوئی اور ملک ہو۔

میرے ساتھی یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ مجھے شہر کی ہر سڑک اور گلی یاد تھی۔ اس بلوچی دروازے کے اندر گھستے ہی میری پہلی واقفیت بھیرے کی بھولی ہوئی خوشبوؤں سے ہوئی اور میرے اندر ایک عجیب خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں ڈگ بھرتا ہوا شہر کے دوسرے سرے پر گنج منڈی والے چوک میں جا پہنچا۔ مجھے تھانے کا وقوعہ بھی یاد تھا۔ انسپکٹر میری طرح ہی درمیانی عمر کا تھا اور بھیرے کے بہت سے ساہنیوں کو جانتا تھا۔ بڑی محبت سے پیش آیا' بلکہ پاسپورٹ پر آمد اور رخصت دونوں کے اندراج بیک وقت کر دیے تاکہ ہمیں دوبارہ تھانے میں آنے کی ضرورت نہ پڑے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا' "دیکھا' اپنے اور پرائے شہر میں ایک فرق ہوتا ہے!"

وہ بھی اور انسپکٹر بھی خاموش رہے۔ میں خود جانتا تھا کہ یہ شہر اتنا ہی میرا ہے جتنا دلی سکندر کا! لیکن میں سیانا بننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لڑکوں نے بہت کہا کہ کسی واقف کار کو ساتھ لے چلیں' لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ گنج سے اپنے محلے کی جانب اسی طرح دوڑ پڑا جیسے ڈاکٹر کچلو کی تقریر والے دن بھاگا تھا۔ لیکن پرانے محلے کے نزدیک پہنچ کر گڑبڑا کر رہ گیا۔ ہر جانب عمارتیں گر کر ڈھیر بنی ہوئی تھیں' سارا حلیہ بدل چکا تھا۔

ہماری گلی کی نکڑ پر ایک کنواں ہوا کرتا تھا۔ اس کے عین سامنے میرے چاچا جی کا گھر تھا۔ گلیوں کے کشادہ سے سنگم پر سارا دن عورتیں چرخے رکھ کر کاتتی رہتی تھیں۔ میرے چاچا جی کے گھر کا دروازہ پرانے ڈھنگ کا تھا' لکڑی پر بہترین چوب کاری کا کام تھا۔ بڑی مشکل سے کنواں تو مل گیا' لیکن آس پاس کوئی گلی اور نہ ہی کوئی مکان۔ یوں لگا جیسے ابھی ابھی کوئی ہوائی حملہ ہوا ہے' اور ہر جانب ملبے کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ خال خال ہی کوئی عمارت ثابت کھڑی تھی۔

ساتھیوں نے ہمت بندھائی۔ ادھر ادھر سے پوچھ کر چودھری غلام محمد کا گھر ملا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ باہر آئے۔ میری ہی عمر کے تھے۔ دیکھتے ساتھ ہی مجھے ان کے بچپن کا روپ بھی یاد آ گیا۔ بچپن میں ہم اکٹھے کھیلتے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا' میرے پتا جی کا نام سنتے ہی وہ میرے گلے سے آ لگے اور زار و قطار رونے لگے۔ دونوں داوے پوتے بھائی تھے۔ ایک خون' لیکن تقسیم کے بعد وہ مسلمان ہو گئے تھے' میں ہندو رہ گیا۔ وہ پاکستانی تھے میں ہندوستانی۔ ہماری پیوستہ بانہوں اور چھاتیوں کے درمیان ایک کھائی

تھی ----- اتنی گہری اور چوڑی کہ جس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہوئے بھی اس کھائی سے غافل نہ ہو سکے۔ اس غیر شعوری حالت نے مجھے اتنا بھونچکا کر دیا کہ میں رو بھی نہ سکا۔

پھر وہ ہمیں گھر کے اندر لے گئے۔ گھر نیا نیا بنا تھا۔ باہر ٹبہ تھا' جیسے ہمارے گھر کے سامنے ہوتا تھا۔ اس کے اوپر سے ان کی سفید برقعہ پہنے گزرتی ہوئی بیوی ----- میری بھابھی ----- مکان کے پچھواڑے چلی گئی۔ چودھری صاحب نے اندر جا کر اسے چائے بنانے کو کہا۔ پھر ان کا کوئی اٹھارہ برس کا لڑکا اندر آیا' انور نام تھا شاید اس کا۔ اس نے میرے پاؤں چھوئے' میں نے پیٹھ پہ ہاتھ پھیر کر پیار دیا۔

چالیس برس کم نہیں ہوتے' اور پھر جب ہم چھوٹوں نے بھیرے کا شوق چھوڑ دیا تو ماں باپ نے یہاں آ کر کیا کرنا تھا۔ میں نے چودھری صاحب سے اپنے مکان کے متعلق پوچھا' لیکن انہوں نے گول مول سا جواب دیا۔ درحقیقت انہیں یہ یاد نہیں رہا تھا کہ چچوں تایوں کے لاتعداد مکانوں میں میرے پتا جی کا مکان کون سا تھا۔ لیکن ان کی اس بے معنی سی خاموشی سے مجھے شک ہونے لگا کہ جس مکان میں میں بیٹھا ہوا ہوں یہی ہمارا مکان ہے' چودھری صاحب نے اسے مسمار کر کے اپنی زمین کے ساتھ ملا لیا ہے اور یہ نئے کمرے بنا لئے۔ سامنے والے ٹبے کو دیکھ کر میرا شک اور بھی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن مجھے ایسا ہونے کا کوئی رنج محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ بہت تسلی تھی کہ خاندانی چیز اپنے ہی بھائی کے کام آ گئی۔ لیکن ساتھیوں کو میرے دل میں اٹھتی ہوئی دلیلوں کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بار بار وقت کی قلت کی جانب اشارہ کرتے اور کہتے' "اپنا مکان بھی تو ڈھونڈیے" اور میں انہیں ٹال دیتا' "نہیں نہیں' اپنے بھائی سے مل لیا ہے' اب مجھے مکان دیکھ کر کیا کرنا ہے۔"

چودھری صاحب نے اپنے بیٹے سے کہا' "انور' جا دوست محمد کو بلا لا' شاید اسے پتہ ہو۔" تھوڑی دیر میں بوڑھا دوست محمد بھی آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سر پہ سفید پگ باندھ رکھی تھی۔ ہو بہو اسی طرح جیسے میرے پتا جی باندھتے تھے۔ شکل و صورت' بول چال بھی ان سے ملتی تھی۔ اس دوست محمد نے کئی برس تک دیوان دیس راج ساہنی کی دیکھ بھال کی تھی۔ دیوان صاحب بیرسٹر تھے اور راولپنڈی میں پریکٹس کرتے تھے۔ میری بھوآ کی بیٹی ان کی بہو تھی۔ دیوان صاحب بٹوارے کے دن تک باقاعدہ چکر لگا جایا کرتے تھے' کیونکہ بھیرے کے آس پاس ان کی زمینیں بھی تھیں۔ لیکن دوست محمد کو ہمارا گھر بھول گیا تھا کیونکہ میرے پتا جی کم و بیش ہی بھیرے جاتے تھے۔ اگر میں مزید تفصیل سے نشانیاں بتاتا تو

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

شاید انہیں کچھ یاد آ جاتا' لیکن حالت ہی کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ غلام محمد ایک طرف کرسی پہ سر جھکائے لگاتار روتا جا رہا تھا' ادھر بوڑھے دوست محمد کی آنکھوں میں سے بھی جیسے گنگا جمنا بہہ نکلے تھے۔ میرے اپنے لئے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

آخر کار سکندر نے دھیرے سے مجھے اٹھا دیا اور کہنے لگا "چلئے' جب تک چائے تیار ہوتی ہے' باہر کا ایک چکر لگا آتے ہیں۔"

میں بے دلی سے پھر گلی میں آ گیا۔ بالکل اجنبی لگ رہی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ میں اس گلی میں کھیلا کرتا تھا! وہ تو اتنی لمبی' کھلی اور خوبصورت ہوتی تھی' یہ اتنی چھوٹی' تنگ اور بدصورت؟

سکندر نے مجھے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگانے کو کہا۔ اچانک ایک گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر اس کے صحن میں پڑی۔ میں رک گیا' اور کہا "میں اس گھر میں کھیلا کرتا تھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہم اس کے کوٹھے پہ بھی چڑھتے تھے۔ یہاں میرا دوست رہتا تھا۔"

سیڑھیوں کے پاس ایک غریب سا آدمی چادر لپیٹے پڑا ہوا تھا۔ سکندر نے اس سے اندر آنے کی اجازت مانگی اور مجھ سے کہا "جائیے اندر' اوپر بھی جائیے۔"

"نہیں' اندر جا کر کیا لینا ہے؟" میں نے کہا۔

اب اس بائیس تیئس برس کے سکندر نے گلی میں کھڑے ہو کر مجھے یوں ڈانٹا جیسے وہ میرا کوئی بزرگ ہو۔

"ساہنی صاحب! آپ کیسے فضول سے تکلفات کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم بھی آپ ہی کی طرح ہیں۔ جب کبھی دہلی جائیں' اپنے چھوڑے ہوئے گھروں کا کونہ کونہ چھان مارتے ہیں' چاہے کسی کو کتنی بھی تکلیف ہو۔ آپ نے یہاں رہنا تھوڑے ہے کہ ہر کسی کا اتنا لحاظ کئے جا رہے ہیں؟ دو گھنٹے بعد آپ کو یہاں سے چلے جانا ہے اور پھر آپ کو خدا جانے کبھی ادھر آنا نصیب بھی ہو یا نہ ہو! یہ سستی چھوڑیئے' اور ایک جگہ بیٹھ کر وقت گنوانے کی بجائے جتنا گھوم سکتے ہیں دیکھئے۔ برائے مہربانی جائیے۔"

ان سیڑھیوں پہ دوبارہ قدم رکھ کر کتنا لطف آیا۔ اوپر کوٹھے پر پہنچے تو عین اپنی آنکھوں کے سامنے' دور' مجھے اپنے گھر کا اوپر والا شعبہ صاف نظر آ گیا۔ اس کے دائیں جانب والی رسوئی (کھانے پکانے کی جگہ) دکھائی دی اور میں چیخ اٹھا "وہ' وہ ہمارا گھر' اس کمرے میں میری بہن کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ ہماری رسوئی۔"

اسی وقت اندر نجانے کون سا آتش فشاں پھٹ پڑا' میں روتا اور سسکیاں بھرتا ہوا مٹی سے لیپے پوتے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ لوگ دلاسا دینے آئے۔ میں بولتا جا رہا تھا۔۔۔ "مجھے چھوڑ دو۔ میں گھر کو دیکھ نہیں رو رہا۔ مجھے بہن یاد آ رہی ہے' جو مر چکی ہے۔ خدایا میری بہن لوٹا دے' خدایا میری بہن واپس کر دے......" خود پہ شرم بھی آ رہی تھی۔ یہ میں کیا کر رہا ہوں؟

اجنبی دیس' اجنبی جگہ' اجنبی لوگوں کی موجودگی میں؟ لیکن مجھے خود پر کوئی قابو نہیں تھا۔ اگر میرے ہاتھ میں چھرا ہوتا اور میرے سامنے رب آن کھڑا ہوتا تو یقیناً" میں نے اس وقت اسے کاٹ پھینکنا تھا..........

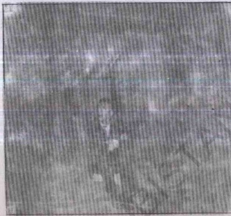

بھیرے کی بہت پرانی گلی کا ایک منظر جہاں مصنف کا بچپن کھیلتے کودتے گزرا۔ وہ ایک دروازے کندہ کاری والے کی دہلیز پہ بیٹھے تماشائی بنے گزرا زمانہ دیکھ رہے ہیں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

10

نیچے اتر کر جب ہم دوبارہ گلی میں آئے تو میں نے خود کو بہت لعنت ملامت کی۔ کیا نادانوں کی طرح اجنبی لوگوں کے سامنے رونا شروع کر دیا میں نے؟ کیا معلوم جس گھر کو دیکھ کر رویا واقعی اپنا تھا یا کسی اور کا؟ کیا معلوم غلط فہمی ہی ہوئی ہو؟ لیکن سکندر نے آگے بڑھ کر اب تک مکان کو تلاش کر لیا تھا۔ میں باہر والے حصے کو پہچان نہیں سکا تھا کیونکہ ٹیبے والی جگہ پر ایک اور مکان بن گیا تھا۔ لیکن اندر جا کر میرے سارے شکوک و شبہات دور ہو گئے۔ وہی گھپ اندھیری ڈیوڑھی (پیش دالان) جہاں ہماری گائے بندھی ہوتی تھی۔ اب اس کلے (کھونٹے) کے ساتھ ایک پیاری سی بچھیری بندھی تھی۔ اندر والے صحن میں لکڑی کی محرابوں والا ایک بر آمدہ تھا' جہاں میرا چھوٹا بھائی ۔ بھیشم کھڈی لگانے کی کھیل کھیلتا تھا۔ چاہے سوت کی کھڈیوں کی طرح وہ کھڈی کھیس نہیں بنتی تھی' لیکن پھر بھی ہمیں وہ بالکل اصلی لگتی تھی۔ کبھی کبھی میں بھی اس پہ بیٹھ کر پیر ہلاتا اور اسے کھینچ کھینچ کر نلی کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چلاتا تھا۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ملحقہ ایک تنگ سی کوٹھڑی تھی جس میں ایک مسلمان پٹواری رہا کرتا تھا۔ پتاجی اس سے کرایہ نہیں لیتے تھے کیونکہ ہماری غیر حاضری میں وہ گھر کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ شام ڈھلے' ایک دیئے کی نہ ہونے کے برابر روشنی میں' چادر لپیٹ کر بیٹھے اور حقے کا لطف اٹھاتے پٹواری کو میں بڑی اوٹ پٹانگ گپیں سنایا کرتا تھا' اور حیرت کی بات ہے کہ وہ بڑے ہی تحمل اور یقین سے سنتا۔ میں اس کو بتاتا کہ کیسے ہمارے پنڈی والے گھر کے سامنے ایک لکڑیوں کی ٹال میں میں نے اور میرے دوستوں نے ایک قلعہ بنایا ہوا ہے۔ لکڑیوں کے ڈھیروں میں آنے جانے کے خفیہ رستے ہیں' جو ہمارے سوا اور کسی کو معلوم نہیں۔ قلعے میں ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے—— "بندوقیں' بم' مشین گنیں۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہیں۔ نالہ لئی کے کنارے سے ہمیں لمبی لمبی نالیاں

مل جاتی ہیں۔ پھر ہم بہت سی نالیوں کو رسی سے باندھ کر ایک سورج مکھی شکل کا چکر بنا لیتے ہیں۔ اس کی اندرونی جانب ایک اور چھوٹا سا گھومنے والا چکر بنانا پڑتا ہے' جسے گھمانے سے کانے کی گری سے بنائی ہوئی گولیاں چھوٹے چکر کی میگزین میں سے نکل کر بڑے چکر کی نالیوں کے راستے فائر کرنے لگتی ہیں....."

یہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کا دور تھا' اور جلیانوالہ باغ کے قتل عام کا۔ پنڈی میں گھر گھر مشین گنوں اور گولیوں کا ذکر ہوتا تھا۔ ایک رات جب میں اور میرا چھوٹا بھائی ایک ہی چارپائی پر نیم خوابی کی حالت میں لیٹے ہوئے تھے' ہم نے ماتا جی کو پتا جی سے دبی آواز میں کہتے سنا "پولیس کو مجھے پہ چڑھ گئی۔ اس نے اپنی چھاتی ننگی کر کے کہا' مجھے گولی مار دو' لیکن میرے بچوں کو کچھ نہ کہو۔"

ہم دونوں بھائی سہم کر آپس میں لپٹ گئے تھے۔ ایک مرتبہ ہمارے چھاچھی محلے میں سے پولیس اور فوج کی پوری پلٹن نے مارچ کیا تھا اور ان گنت آدمیوں کو ہتھکڑیاں ڈال کر لے گئے تھے' جن کی زنجیروں کی جھنکار مجھے آج تک نہیں بھولی۔ ایک داڑھی والا گورا اور حسین گبھرو جس کا نام حسینا تھا اور جس کی ڈیری سے ہمارے گھر دودھ آیا کرتا تھا' تھوڑا سا آگے آ کر ہمارے پاس کھڑا ہو گیا اور پتا جی سے کہنے لگا' "لو بابو جی' آخری سلام۔" اس نے کھدر کا لمبا کرتا اور شلوار پہن رکھی تھی اور کھدر کی ہی سفید پگ اس کے سر پہ تھی......

سکولوں میں لڑکوں کو گول گول سنہری اور چاندی کے تمغے دیئے جاتے تھے۔ ان کی ایک طرف بادشاہ کی اور دوسری طرف ایک گورے اور ایک دیسی سپاہی کے بغل گیر ہونے کی تصویر ہوتی تھی۔ ہمیں ٹھیک سے معلوم نہ تھا کہ یہ گلے مل رہے ہیں یا کشتی کر رہے ہیں۔ کبھی ہم بڑے شوق سے ان تمغوں کو کوٹ کے کالروں پر لگا لیتے اور کبھی اسی شوق سے کسی بڑے کے کہنے پر' ان پر تھوک دیتے' زمین میں دبا کر ان پر پیشاب کرتے' انہیں پتھروں سے کوٹتے........

ایک بانکی مونچھوں والا بیوپاری پتاجی سے ملنے آیا کرتا تھا' جس کے لباس کی خوبصورتی مجھے بہت بھاتی تھی۔ وہ اپنی جیب میں سے ایک ربڑ کی تھیلی نکالتا جس میں ان تمغوں جیسی اور بھی چھوٹی چھوٹی سونے کی اشرفیاں ہوتیں.......

یہ سارے درد انگیز اور راحت رساں واقعات ہم بچوں کے لئے کھیل کا مسالہ بن جاتے تھے۔ لکڑی کا ٹال ہماری نظر میں سچ مچ ایک قلعہ تھا اور ہم حیران تھے کہ اس کے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مالک بخشی صاحب ہمیں داد کی بجائے گالیاں کیوں دیتے تھے۔ مورچے بنا کر چاہے ایک دوسرے کو پتھر ہی مارتے تھے' لیکن دماغ میں تصور بندوقوں اور مشین گنوں کا ہی ہوتا۔

بچوں کا تخیل بہت شدید ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ مستقبل میں ان کا کردار متعین ہوتا ہے' لیکن ماں باپ کی لاڈ بھری جہالت اکثر اسے منجمد کر دیتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے بچے بڑے شوق سے نوکروں کے کوارٹروں میں پناہ لیتے ہیں۔ وہاں انہیں عزت بھی ملتی ہے اور آزادی بھی۔ انسان کے ہر کام میں تخیل کار فرما ہے۔ تخیل پہلے شوق جگاتا ہے' پھر ہاتھ پاؤں عمل کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی کے جیتے جاگتے سپنوں کو ٹھیس لگانا---- چاہے وہ بچے ہی کیوں نہ ہوں---- اس کے شوق اور کام کو بے طاقت کرنا ہے۔ میں ہمیشہ اس پٹواری کو بڑی ہی پیار اور عزت سے یاد کرتا ہوں۔ اس کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکنے کا بے پناہ سکون میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

مکان کی اس نچلی منزل کے پچھواڑے ایک شفعہ تھا۔ اسے ہمارے گھر والے صرف تبھی استعمال کرتے تھے جب کوئی ڈاکہ پڑنے کی افواہ پھیلتی۔ اس میں کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ فرش بھی کچا تھا' جس کے باعث سانپ بچھو کا ڈر بھی رہتا۔ اس وقت اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا' جس کو کھلوانے کی مجھے کوئی خواہش نہ ہوئی۔

پھر سیڑھیوں پہ قدم اٹھاتا ہوا میں اوپر والے کوٹھے پر جا پہنچا جہاں ہمارے گھر والے زیادہ تر رہتے تھے۔ کھلی فضا میں بھولی بسری نشانیاں چاروں طرف سے جیسے اچھل اچھل کر میری جانب آنے لگیں----- پڑوس کی دیواریں' جن کی کھدروں میں طوطوں اور کبوتروں کے گھونسلے تھے' وہ لکڑیوں والا میدان جہاں ڈوڈے اور بنٹے کھیلا کرتے تھے' وہ صحن جہاں سردیوں کی میٹھی دھوپ میں ماں ہمارے سر دھوتی اور "من من" بھر میل اتارتی تھی۔ جس کمرے کو میں نے دوسرے گھروں میں شناخت کیا تھا' ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا فرش سارے کا سارا اکھڑ چکا ہے۔ نچلا شفعہ اور یہ کمرہ مل کر کسی مذہبی ادارے کا ہال کمرہ سا نظر آ رہے ہیں۔ لیکن ساتھ والی رسوئی سلامت تھی' اور اس کی انگیٹھی پر برتن بالکل اسی طرح پڑے تھے جیسے میں نے اپنے بچپن میں دیکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہمارے برتن جوں کے توں اپنی جگہ پر پڑے ہوں' لیکن پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

پھر میں دگڑ دگڑ کرتا ہوا سب سے اوپر والے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ نیچے سے کسی نے آواز دی' "چھت بہت کچی ہے' سوچ سمجھ کر پاؤں رکھنا۔"

واقعی مکان کی حالت کتنی بوسیدہ ہو چکی تھی' جیسے گرنے سے پہلے منتظر ہو کہ ہم میں

سے کوئی آخر مرتبہ آ کر اسے دیکھ لے۔ پاؤں رکھتے ہی چھت میں جھول پیدا ہوتا۔ میں اور سکندر نے بڑی احتیاط سے کوٹھے کا معائنہ کیا۔ منڈیروں کی دیوار میں ایک بہت ہی تنگ سا چبوترہ تھا جو گھر کے سارے بچوں کو اپنی کھیلوں کے لئے بے حد عزیز تھا۔ یہاں میری چھوٹی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ گڈی گڈے کا بیاہ رچاتی تھی۔ میں خود بھی کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر اس کی خاموش خوشی کو دیکھا کرتا۔ گھر کا یہ کونہ کبھی کبھی بمبئی بیٹھے ہوئے بھی میری یاد میں آن دھمکتا تھا۔ آج پھر اسے دیکھ کر جیسے زندگی کی کوئی تکمیل ہوتی معلوم ہوئی۔ جب پہلی مرتبہ میں لاہور گیا تو جیسے افق پر پہاڑوں کی عدم موجودگی کے کسی اٹل دستور کی عادت ہو گئی ہو۔ اس کی وجہ آج اور بھی واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ اپنے بچپن کے دونوں شہروں---- پنڈی اور بھیرہ---- میں میری آنکھیں ہمیشہ پہاڑ دیکھنے کی عادی تھیں۔ میرے تخیل کو پہاڑوں سے سہارا ملتا' میں خود کو محفوظ محسوس کرتا۔ شاید اسی کے زیر اثر مجھے ہمیشہ کسی پہاڑ جیسے انسان کا آسرا ڈھونڈنے کی عادت رہی ہے۔ اپنے سے طاقتور شخصیت کے زیر سایہ میں نشو و نما پاتا ہوں۔ اردگرد پہاڑوں والے ماحول اور پہاڑ جیسے دوست سے محروم ہو کر میں بہت ناتوانی محسوس کرتا ہوں۔

اچانک سکندر نے کہا "بلراج صاحب! آپ واقعی بڑے شاندار آدمی ہیں۔ اتنی بڑی حیثیت والے ہو کر بھی آپ کو یہ اپنا چھوٹا سا پرانا مکان اتنا پیارا لگ رہا ہے۔ عام طور سے فلم سٹار اپنے غریبی کے زمانے کو ہمیشہ بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ کیا ہمارا گھر واقعی چھوٹا اور غریبانہ تھا؟ میں نے اسے غیر جانبدار نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔ واقعی اتنا چھوٹا تھا کہ اس سے چھوٹا مکان میں نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ سونے بیٹھنے کے لئے ایک ہی تو ڈھنگ کا کمرہ تھا اس میں---- وہ جس کا فرش اکھڑ چکا تھا۔ اس میں ہم کیسے سارے گھر والے گزر بسر کرتے ہوں گے' بڑی انوکھی سی بات لگی۔

میری خاندانی عزت نے مجھے جھنجوڑا۔ غریبوں سے چاہے کتنی ہمدردی ہو' آدمی اپنی غریبی کو کم و بیش ہی قبول کرتا ہے۔ میں نے کہا' "یہ تو ہمارا سو برس پرانا مکان ہے۔ ہماری مستقل رہائش تو راولپنڈی میں ہوا کرتی تھی۔ یہاں تو ہم بہت کم آیا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں میرے والد شہر کے بڑے رئیسوں میں گنے جاتے تھے۔"

مکان دیکھ کر باہر نکلے تو میلے کپڑوں والے غریب سے انسانوں کا ہجوم ہمارا منتظر تھا۔ محلے کے جو گھر سلامت تھے وہ اب ان لوگوں کے ہی تھے۔ بولی سے یہ لوگ مجھے کرنال

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

یاروہنگ والی طرف کے گئے۔ ہماری منڈلی کا محلے میں ادھر ادھر گھومتے پھرنا انہیں اچھا نہیں لگا تھا' جیسے ان کی اپنی حفاظت کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہو گیا ہو۔ بھلا یہ کون بھارتی ہندو تھا جس کی اتنی خاطر مدارت ہو رہی تھی؟ مجھے دیا جانے والا پیار جیسے انہیں حاسد بنا رہا تھا۔ مجھے ان کی آنکھوں میں چلبلاتا ہوا غصہ نظر آیا' جو ان کی بے چارگی کو اور بھی واضح کر کے پیش کر رہا تھا۔ ایک شخص' جس نے تین چار سال کا بچہ اٹھایا ہوا تھا' آگے بڑھ کر چلاتی ہوئی آواز میں بولا' "کیا دکھڑے رو رہے ہو اس دو کوڑی کے مکان کے۔ جو کچھ ہم پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں' جو ہم پر گزری ہے اور گزر رہی ہے' اس کا بھی کچھ درد ہے کسی کو؟"

اس کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی آگے بڑھ کر بولنا شروع کر دیا۔ میرے ساتھیوں نے فورا" انہیں ڈانٹ کر پیچھے ہٹا دیا۔ لیکن مجھے لگا کہ ایسے کرتے ہوئے وہ میرے نہیں رہے' ان کے ہو گئے تھے' اور میں تن تنہا پردیسی کے روپ میں رہ گیا تھا۔ باہر سے آئے ہوئے مہمان کو پریشان کرنا خلاف تہذیب تھا' وہ صرف اس وجہ سے ان کو چپ کرا رہے تھے' چاہے اندر سے ان کے جذبات کچھ اور ہی ہوں۔ لیکن اس وقت مجھ سے مہمان بن کر نہ رہا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس آدمی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا جو سب سے پہلے بولا تھا:

"بھیا۔" میں نے کہا' "یقین مانو میں تمہارا دل دکھانے نہیں آیا۔ میں تمہارا دکھ اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ میں یہاں کون سا روز روز آؤں گا۔ اگر انجانے میں مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دو۔"

میں نے اس کی بچی کو اس کے کندھے سے کھینچ کر خود اٹھا لیا۔ پیار سے اس کا منہ چوما اور پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور پھر ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

راستے میں سوچتا رہا۔ اپنے پرانے مکان کو دیکھ کر مجھے تو عجیب طمانیت ملی' لیکن جو شخص اس میں آج کل رہائش پذیر ہے' اسے یہ مکان کیا سکھ پہنچا سکتا ہے۔ اس کے اہل خانہ کو تو اس سے ہر دم جان کا خطرہ ہی ہے نا۔ نہ اس آدمی کے پاس اسے مرمت کرانے کی توفیق ہے اور نہ ہی چھوڑ کر کہیں اور جانے کی۔ صرف ہمارے مکان کا نہیں' ساہنیوں کے محلے کے بچے کھچے سارے مکانوں کا لگ بھگ یہی حال تھا۔ اونچے درجے کے لوگوں کو ادھر گشت کرتے دیکھ کر شاید ان غریبوں کو گمان ہوا ہو کہ بڑا افسر حالت کا مطالعہ کرنے آیا ہے اور ان کی داد و فریاد سنے گا۔ دن دیہاڑے ان کا اتنی بڑی تعداد میں جمع ہو جانا کیا ان کی

بے روزگاری کا غماز نہیں تھا؟ یہ بھی صاف دکھائی دے رہا تھا کہ جدا بولی اور کردار کے باعث وہ ابھی تک مقامی لوگوں سے مکمل مل نہیں سکے۔

کوہلی کے محلے میں میری بھوآ کا گھر تھا۔ بسوں کے اڈے پر واپس جانے کے لئے ہم نے اسی طرف سے گزرنا تھا۔ میرے دل بھوآ کا گھر دیکھنے پر بھی للچانے لگا۔

وہ طرف کچھ بہتر حالت میں تھی۔ جس جس گلی اور بازار میں سے گزرتا اسے چپہ چپہ پہچانا جاتا تھا۔ کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ یہاں زندگی بالکل اسی ڈھنگ اور رفتار سے چلتی لگتی تھی جیسے آج سے نصف صدی پہلے۔ اگر کوئی تبدیلی نظر آئی تو وہ تھی گرے ہوئے مکان۔ کسی نے بتایا کہ اس کی وجہ دریائے جہلم کا شہر کے بالکل قریب آ جانا ہے۔ لیکن صرف یہی سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ گرنے والے مکانوں میں زیادہ بڑی تعداد بہت زیادہ پرانے چھوٹی اینٹ والے مکانوں کی تھی جن کے دروازوں اور چھجوں پر کی ہوئی چوب کاری اپنی خوبصورتی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے اور جس کے نمونے لاہور کے عجائب گھر میں بھی رکھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں دروازہ اب بھی نظر آ جاتا اور دیکھ کر بہت خوشی ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ تقسیم کے بعد جب مکان نئے سرے سے الاٹ کئے گئے ہوں گے تو پیسے والوں نے انہیں مسمار کر کے نئے سرے سے بنانے کا ارادہ کیا ہو گا' جو شاید کاروباری نکتہ نظر سے فائدہ مند نہ دیکھ کر ملتوی کر دیا گیا۔ اور جن کے پاس پیسے نہیں تھے انہوں نے مکانوں کو اور اپنے آپ کو بھی خدا کے آسرے پر چھوڑ دیا ہو گا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر بھیرے جیسے انتہائی قدیم تاریخی شہر کی حفاظت حکومت نے خود حفاظت کی ہوتی۔ یہاں بہت کچھ سنبھال کر رکھنے کے قابل تھا۔ یورپ میں پرانے شہروں کی بہت قدر کی جاتی ہے' لیکن یہ صفت ہم لوگوں نے ابھی نہیں سیکھی۔

بازار سے کوہلیوں کے محلے کی گلی میں داخل ہوتے ہوئے میری بھوآ کا دائیں جانب پہلا گھر تھا۔ یہ بات مجھے پکی یاد تھی۔ میں مکان کی شکل و صورت نہ پہچان سکا' لیکن یقین تھا کہ مکان یہی ہے۔ جب میرے ساتھیوں نے گھر والوں سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی تو انہوں نے کہا' "کوئی نشانی بتاؤ۔ اگر ٹھیک نکلی تو تمہیں اندر آنے کی اجازت دیں گے۔"

ابھی انہوں نے بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ میں دھڑلے سے بول اٹھا "اندر کہیں لال پیلے نیلے رنگ کے شیشے لگے ہوئے ہوں گے۔" بھیرے پہنچ کر میرے اندر جو آٹھ برس کا بچہ جاگ اٹھا تھا' وہ پھر رونے لگا۔

گھر والوں کا ایک آدمی کچھ دیر کے لئے اندر گیا اور پھر باہر آ کر کہنے لگا "آ جاؤ بڑی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

خوشی نال، آپ مکان دیکھ سکدے ہو۔"

اوپر والی منزل کے کمرے میں کھڑکیوں پر واقعی رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے ساتھیوں نے تو حیران ہونا ہی تھا، میں خود بھی اپنے حافظے کی کرامات پر ہکا بکا رہ گیا۔

اچانک میری سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ یہ شیشے میرے حافظے میں کیسے ابھرے ہوں گے۔ ایک مرتبہ پتا جی مجھے اپنے ساتھ کسی شادی پر پنڈی سے بھیرے لے گئے تھے۔ وہاں جا کر میں بیمار ہو گیا اور مجھے بھوآ کے گھر رکھا گیا تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی چھ برس ہو گی۔ میری چارپائی کے ساتھ ہی میری "پھپھیری بہن کی چارپائی تھی، جو مجھ سے چھ سات سال بڑی تھی۔ وہ بھی بیمار تھی۔ صبح کے وقت نوکر ہم دونوں کے لئے دودھ کے گلاس لے آتا۔ میں غٹاغٹ پی جاتا، لیکن وہ اپنا گلاس ہاتھ میں پکڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر بڑی دیر تک میری جانب دیکھتی رہتی۔ اسے دودھ سے نفرت تھی اور حیران ہوتی کہ میں کیسے اتنی آسانی سے یہ پی لیتا ہوں۔ کافی دیر تک میری جانب گھورنے کے بعد وہ کھڑکی میں سے اپنے گلاس باہر گرا دیتی۔ وہ یہی شیشوں والی کھڑکی تھی۔

اور بھی کئی یادیں ابھر آئیں۔ بھوآ مجھے کتنا پیار کرتی تھی۔ سارے گھر میں ایک وہی مجھے "ملی" کہہ کر بلاتی تھی۔ اس کا اپنا کمرہ کشمش، بادام، مصری، الائچی وغیرہ کی "چنگیروں" سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا اور اس کے ہاتھ میں جو کھانے کا مزہ تھا وہ اپنی ماں کے ہاتھ میں بھی نہ ملتا۔ اسے کپڑوں کا بھی بہت شوق تھا۔ جب میں سکول میں علی بابا کی "کھل جا سم سم" والی غار کے بارے میں پڑھتا تو فوراً" اپنی بھوآ کا یہ جگمگ کرتا کمرہ یاد آ جاتا تھا۔ میری بھوآ کی سب سے چھوٹی بیٹی اس وقت ڈیڑھ دو سال کی تھی۔ چند دن پہلے ہی اس کا سر مونڈا گیا تھا اس لئے ہر وقت سر پر ریشم کا رنگین رومال باندھے شور مچاتی رہتی، "نہیں دینی سرکار پرچی نہیں دینی۔"

بزرگ لوگ گھر میں داخل ہوتے ہی آواز دے کر پوچھتے "تو شی! پرچی دینی ہے کہ نہیں؟" وہ جہاں بھی ہوتی چیخ پڑتی "نہیں" اور سارے گھر میں قہقہوں کی آواز آنے لگتی۔ شاید یہ رولٹ ایکٹ کا زمانہ تھا۔

جب باہر آ کر میں مکان کی تصویر لینے لگا تو ایک بوڑھی سی عورت میرے بازو پکڑ کر کہنے لگی، "وے چرن جیت لال دا مکان ویکھ لیا ای، تاں شیورام دا نئیں ویکھنا؟"

فوراً" ہی مجھے پھر رونا آ گیا۔ یہ بڑھیا ہمارے اپنے خاندان کی ہی لگتی تھی۔ کوئی

میرے بدن میں نشتر گھونپ دیتا تو بھی مجھے یقین نہ آتا کہ وہ میرے لئے غیر ہے۔ یہاں بھی اب کافی بھیڑ جمع ہو گئی۔ تھڑے کے اوپر میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میری بھوآ کو یاد کر کے وہ بھی روتی جا رہی تھی اور میں بھی۔ میرے پھوپھڑ (پھوپھا) کے چھوٹے بھائی شیورام کا مکان بعد میں بنا، اسی لئے مجھے یاد نہیں تھا۔ اس وقت اس گھر کے آس پاس کافی کھلی زمین تھی، جہاں بلوچوں کا ڈیرہ تھا۔

ہمارے اپنے مکان کی طرح میری بھوآ کا مکان بھی کسی مہاجر نے لے لیا تھا۔ جب میں بڑھیا کے سامنے بیٹھا بیتے دکھ سکھ میں غلطاں تھا تو اس نے آگے بڑھ کر اور طرح کے قصے چھیڑ دیئے۔ اسے شک تھا کہ ساتھ والا مکان بھی، جس کا بیرونی دروازہ سڑک پہ کھلتا تھا، اسی مکان کا حصہ ہے۔ وہ شاید اسے بھی اپنے قبضے میں لینا چاہتا تھا۔ وہ منت سماجت کرنے لگا کہ میں اسے لکھ کر دے دوں کہ دونوں مکان میرے پھوپھا جی کی ملکیت تھے۔ لیکن میری یاد کے مطابق یہ بات غلط تھی، اس لئے میں نے لکھ کر دینے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر وہ بہت خفا ہوا۔ چاہے میں اس پر کہیں زیادہ خفا تھا۔ وہ میرے سینوں کو ناخن مار رہا تھا۔

بس میں بیٹھ کر ہم دوبارہ سرگودھا والی سڑک پر آ گئے۔ کل تین گھنٹے بھیرے میں گزارے تھے۔ لیکن میں اپنے آپ کو اتنا مالدار محسوس کر رہا تھا جیسے دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ مل گیا ہو۔ سڑک کنارے بیٹھا کوئی بزرگ مجھے پتا جی جیسا لگتا، کسی گھر کی کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی کوئی عورت مجھے اپنی بیٹیوں بہنوں جیسی لگتی۔ اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو گی کہ میں اپنے آباؤ اجداد کی دھرتی کی، جس کے ساتھ میرا گوشت پوست بندھا ہوا تھا، کوئی خدمت نہ کر سکا۔ وہاں کے لوگوں کے کسی کام نہیں آ سکا۔ قسمت اس سے بڑی بددعا کیا دے سکتی ہے؟

لیکن چالیس برس بعد میں یہاں لوٹ کر آیا تو سہی، اپنی دھرتی پر اس کی اولاد کو دیکھا تو سہی۔ وہ بھی تو ہیں جنہیں اب بھی اپنے گاؤں سے، اپنے پڑوسیوں سے، اپنی بولی اور ثقافت سے نفرت ہے۔ جو اپنے آپ کو پنجابی تسلیم کرنے پر شرمسار ہیں۔ کم از کم ان جیسا نادان تو نہیں ہوں میں۔ چلو یہ بھی غنیمت ہے۔

واپس سرگودھا پہنچ کر بھی یوں محسوس ہوتا رہا جیسے اتنا راحت رساں دن دنیا میں کبھی طلوع نہیں ہوا۔

تار گھر میں جا کر اپنی ماں کو ایک تفصیلی تار بھیجی۔ رات کو جب موہن لال ساہنی جی کے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھا روٹی کھا رہا تھا تو وہ کہنے لگے "مہراج! آج تو بڑی پکی بھروچی بولی

بول رہا ہے۔ اتنی جلدی کیسے سیکھ لی؟......"

17 اکتوبر' 1962ء

صبح سات بجے سرگودھا سے لالہ موسیٰ جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ کل والی شگفتگی دل میں سے اسی تیزی کے ساتھ غائب ہو چکی تھی جس تیزی سے آئی تھی۔ جیسے جیسے گاڑی چھک چھک کرتی آگے کو چلتی جاتی' بھیرہ کھو جانے کا دکھ دہکتی ہوئی سلاخ کی مانند میرے کلیجے میں دھنستا جاتا۔ چالیس برس بعد جس دھرتی کو صرف تین گھنٹے کے لئے دیکھ کر اتنا ریجھ گیا تھا' اب پھر' اور شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

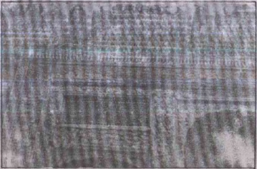

بھیرے میں پرانے مکانوں کے دروازوں پر کئے گئے کندہ کاری کے کام کا ایک نمونہ

11

سرگودھا سے صبح سات بجے روانہ ہونے والی گاڑی گیارہ بجے لالہ موسیٰ پہنچی۔ پاکستان میں گاڑیوں کے نام بڑے خوبصورت رکھے گئے ہیں..... تیز گام' تیز رو' سبک گام' سبک رو۔ ایک تیز گاڑی جو کراچی سے پشاور تک جاتی ہے اور جس میں بیٹھ کر میں پنڈی پہنچا تھا' کا نام ہے "ڈاچی۔" پتہ نہیں جس میں سفر کر کے لالہ موسیٰ پہنچا اس کا کیا نام ہے؟ برانچ لائن گاڑیوں کے شاید نام نہیں رکھے جاتے' ورنہ اس کا نام ضرور "سست رو" ہوتا تھا۔

سرگودھا سے پنڈی روانگی

ایک زمانہ تھا جب پنڈی سے لاہور تک کی دوڑ کار نمایاں مانی جاتی تھی۔ اس وقت میرے دل میں لالہ موسیٰ کا دو طرح کا تصور تھا۔ ایک یہ کہ پنڈی اور لاہور کے درمیان وہ

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

خط امتیاز کی طرح ہے۔ دوسرے، بھیرے آنے جانے والے "لالوں" کو یہاں کئی گھنٹے "مسنا" (باسی ہونا) پڑتا ہے۔ یہ دوسری صفت تو اب بھی قائم تھی۔ سٹیشن پر تین گھنٹے بیکار بیٹھ کر کاٹنا پڑے۔

لیکن مجھے کوفت نہ ہوئی۔ اکتوبر کا نصف آخر شروع ہو چکا تھا۔ اس موسم میں لاہور میں اب بھی دن کے وقت گرمی ہوتی ہے، لیکن پوٹھوہار کی دھرتی پر پہاڑوں سے ٹھنڈی ہوائیں آ کر دھوپ میں گرمائش اور کچھ قراط سونا مزید بھر دیتی ہیں۔ یہ موسم بہت سہانا ہوتا ہے اور پردیس میں بیٹھے پوٹھوہاری کو کبھی نہیں بھولتا۔ دوپہر کے وقت سڑکوں اور دیواروں پر قبل از وقت طویل ہوتی پرچھائیوں کو حافظہ ہمیشہ سنبھال کر رکھتا ہے۔ اس موسم میں مجھے اپنا سکول بھی اچھا اچھا لگنے لگتا تھا، کیونکہ ماسٹر کچھ سست ہو جاتے اور کم مارتے۔ سکول کا وقت بدل جاتا۔ ماں ہمیں صبح تقریباً" نو بجے اچھی طرح کھلا پلا کر بھیجتی اور واپسی پر ہلکی آنچ پر دودھ کاڑھنے کے لئے رکھ دیتی، جس میں بادام ہوتے، چھوہارے، الائچیاں، خشخاش اور نجانے کیا کیا۔ شام تک یہ دودھ ابل ابل کر سرخی مائل اور دھوپ جیسا ہی گاڑھا ہو جاتا۔

میں اس خصوصی دھوپ کا لطف اٹھاتے ہوئے پلیٹ فارم پر کتنی ہی دیر ٹہلتا رہا۔ سٹیشن ذرا بھی نہ بدلا تھا، سوائے اس کے کہ گاہے بگاہے لاؤڈ سپیکر پر نہایت شستہ اردو میں گاڑیوں کے آنے کی اطلاع دی جاتی۔ یہ لاؤڈ سپیکر ہندوستان کے سٹیشنوں پر بھی لگ گئے ہیں، لیکن ان پر زبان کا جو حال کیا جاتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ ہندوستان کے سرکاری محکموں میں ہندی بگاڑ کر اور انگریزی سنوار کر بولنا اعلیٰ تہذیب اور پوزیشن کا اشتہار ہے۔ ہوائی جہازوں میں ہوسٹسیں بھی بولتے وقت قومی غیرت کو بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان افسروں اور اونچے عہدوں کے لوگوں کو میں نے انگریزیت کے خبط سے آزاد دیکھا۔

خانساماں میرے لئے ویٹنگ روم میں روٹی لے آیا۔ اس کے ساتھ والے ڈریسنگ روم میں ایک لکڑی سے بنی ہوئی جائے نماز پڑی تھی۔ دوپہر کی نماز کے وقت ریلوے کے چھوٹے اور بڑے اہلکار باری باری اندر آتے، جائے نماز بچھاتے اور نماز پڑھتے۔ کافی دیر تک یہی آمدورفت جاری رہی اور اسے دیکھ کر میرا دل چٹکیاں لینے لگا۔

اس عبادت کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ضرور ہوتا ہو گا" میں نے سوچا؟ چاہے تھوڑی دیر کے لئے سہی، چھوٹے اور بڑے اہلکار خود کو ایک دوسرے کے نزدیک نزدیک اور برابر محسوس کرنے لگتے ہوں گے؟ ان کے انداز میں انکساری آ جاتی ہو گی؟ مسافروں کے ساتھ

سلوک بہتر ہو جاتا ہو گا؟

اسلام کی بیش قیمت سماجی اور جمہوری روایات ہیں۔ جب میں کالج میں زیر تعلیم تھا، سر سکندر حیات خان کچھ مہینوں کے لئے پنجاب کے گورنر متعین ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی رہائش گورنمنٹ ہاؤس میں تبدیل نہیں کی تھی۔ اپنی کوٹھی کے احاطے میں ہی ایک اونچے مستول پر یونین جیک لگوا لیا۔ ان کے پہلے ہندوستان گورنر بننے پر لوگوں کو مان تھا۔ ایک شام جب ان کا لڑکا شوکت، جو میرا ہم جماعت تھا، اور میں ان کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو عجب منظر دیکھا۔ قطار در قطار بچھی دریوں پر امیر اور غریب، دونوں قسم کے ملاقاتیوں کی بھیڑ لگی تھی۔ اس کے عین درمیان میں سر سکندر خود بھی بڑی بے تکلفی سے متمکن تھے اور حقہ بھی سانجھا کر رہے تھے۔ جس تانگے میں ہم آئے اس کا کوچوان بھی فوراً" دری پر آ بیٹھا تھا اور حقے کا کش لگا کر چلتا بنا۔ میں بہت متاثر ہوا اور شوکت نے اس شام اسلامی اشتراکیت پر مجھے اچھا خاصا لیکچر پلا دیا۔

قیام پاکستان کے بعد وہاں کے عوام نے ضرور آس لگائی ہو گی کہ اب نظام انہی جمہوری اور شراکتی نہجوں پر چلے گا۔ لوٹنے والے انگریز چلے گئے، سود خود کھشتری دفعہ ہو گئے، اب بھلا کیا رکاوٹ رہ گئی۔

ان کی یہ آس کس حد تک پوری ہوئی، وہ خود ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن ایک باہر سے آیا ہوا، سرسری نظر دیکھنے والا، مہمان اتنا ضرور کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود سے شاید اتنے ہی دور ہیں جتنے ہم خود۔ غریب امیر کے فاصلے ویسے ہی موجود ہیں، ممکن ہے مزید شدید ہو گئے ہوں۔

ہمارے ہندوستان میں تو مذاہب کا کوئی حساب نہیں......... ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، بودھ، جین اور بے شمار دیگر عقائد و مسالک۔ اگر ہمارے سٹیشنوں پر بھی اسی طرح اہلکاروں کو اپنے انداز سے عبادت کرنے کی سہولت دی جائے تو ممکن ہے، جس رفتار کے ساتھ ان کا کردار سدھرے اس سے کہیں جلدی محکمہ ریلوے کا کاروبار ختم ہو جائے۔

عزت، انصاف، انسانیت کی اقبالمندی کا وعظ دنیا کے ہر عظیم آدمی نے دیا ہے۔ کیموزم کو بدنام کرتے وقت ہندو بھائی فوراً"——

"سورے بھو نجوت لکھمن: سورے سنتو زامیہ"

کے حوالے دینے لگتے ہیں اور سکھ بھائی دسویں گرو کے اس جملے کا——

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"سبھے ساجھی وال سدائن کوئی نہ دسے باہرا جیو۔"

لیکن عظمت کی کسوٹی ورد کرنے یا مذہبی رسم و رواج کا پابند ہونا نہیں' وہ ہمارا عمل ہے۔ سچا وہ جس کا عمل سچا۔

کل رات کا ایک واقعہ یاد آیا۔ لڑکے بالے مجھے کھینچ کر سینما لے گئے تھے۔ یہ سینما بھی' جسے میں بھولتا نہیں' اس سابقی مسلمان بھائی کا تھا جس کی دکان پر میں سرگودھا میں پہلی شام کو جا بیٹھا تھا۔ پکچر کا نام تھا "اور چراغ جلتا رہا۔" اس کے پروڈیوسر ڈائریکٹر پہلے ہندوستانی اور پھر پاکستان سول سروس کے ایک اونچے افسر رہ چکے ہیں۔ ریٹائر ہو کر فلمی شعبہ کو ترقی دینے کے مبارک ادارے سے یہ پہلی فلم بنائی ہے۔ فنی پہلو کافی کمزور ہے۔ (فلم سازی کا کام اندر سے اتنا آسان نہیں جتنا باہر سے نظر آتا ہے۔) لیکن خیال اور نظریے کے نکتہ نظر سے صاف ستھری اور اصلاحی فلم ہے۔ اس میں ایک نظریاتی مسلمان خاندان کو دکھایا گیا ہے' جو بڑی سے بڑی آزمائش کے وقت بھی صبر صدق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ راہ حق پر چلتا ہے۔

وہ راہ کیا ہے؟ ہمیشہ سچ بولو' برے سے برے دشمن کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آؤ۔ محبت اور عدم تشدد کے ذریعہ ایک نہ ایک دن ضرور آپ اس کا دل جیت لیں گے۔ رب کے گھر دیر ہے' اندھیر نہیں۔ کبھی اپنے دل میں برے خیالات نہ لائیں۔ دنیاوی لالچ اور حرص سے مکت ہونے کی کوشش کریں۔ سادہ کھانا' سادہ رہنا' سچی نرم دلی' انسانیت کی خدمت' یہی اعلیٰ ترین زندگی کے بنیادی اصول ہیں۔

لیکن یہی تعلیم تو سب سماجی مصلحین بھی دیا کرتے ہیں؟ بابا نودھ سنگھ کا کردار بھی تو بھائی ویر سنگھ نے اسی فارمولے کے مطابق گھڑا تھا۔ سچے ہندو یا سچے سکھ کی جو تفسیر کی جاتی ہے' وہی اس فلم کی رو سے ایک سچے مسلمان کی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے پریم چند کا کوئی ناول پڑھ رہا ہوں۔ مہاتما گاندھی اور ٹالسٹائی کے خیالات بھی تو یہی ہیں؟

ہال خالی پڑا تھا۔ بمشکل دو سو افراد ہوں گے اور وہ بھی بڑی بے دلی سے فلم دیکھ رہے تھے۔ میرے ساتھیوں میں سے بھی کسی کو فلم پسند نہ آئی۔ شو کے خاتمے پر وہ میری رائے طلب کرنے لگے۔ جب میں نے کہا کہ مجھے فلم پسند آئی ہے تو وہ مذاق کرنے لگے کہ میں ڈپلومیسی کر رہا ہوں دل کی بات نہیں بتا رہا۔ اس الزام میں تھوڑی بہت سچائی بھی تھی۔ پردیس سے آیا آدمی گھر کے بچے کی طرح کھل کر تنقید نہیں کر سکتا' لیکن جب میں نے وضاحت کی کہ میرے نکتہ نظر سے فلمیں محض سامان تفریح نہیں ہوتیں اور کوئی بھی فلم' جو

اصلاح معاشرہ کے جذبے سے بنائی گئی ہو' قابل احترام ہے تو انہوں نے بے یقین خاموشی کے ساتھ سر ہلا دیئے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان نوجوانوں کا ان نظریات سے یقین ہی اٹھ گیا تھا جو اس فلم میں سکھلائے گئے تھے۔ ان کا تجربہ حیات بتاتا تھا کہ اکثر ان نظریات کا اعلان کرنے والے ہی اندر کھاتے ان کا گلا دباتے ہیں۔

مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے ملک ہندوستان کی غیر مذہبی فوقیت بیش بہا ہو لگنے لگی۔ بہتر یہی ہے کہ انسان مذہب کی دوڑ' اپنے ضمیر اور اپنے خدا تک ہی محدود رکھے۔ اگر ایسا کرنے میں وہ کامیاب ہے تو قدر و منزلت پیدا ہو گی۔ یہی ہمارے پرکھوں کی ریت رہی ہے۔ مذہب کا سماجی اور حکومتی امور میں عمل دخل جتنا کم ہو اتنا ہی بہتر ہے۔

بھارت کے عوام اپنے طرز عمل سے آہستہ آہستہ اس بات کو سیکھ رہے ہیں' چاہے سرپھروں کی ابھی بھی کمی نہیں۔ ایک وقت تھا جب حکومت کی مضبوطی عوام کو لڑانے پر منحصر تھی۔ یہ انگریز راج کا دور تھا۔ اس کام کے لئے ضمیر فروش لوگوں کو آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب آزاد حکومت کے لئے استحکام کی بنیادی شرط بھرپور ملکی یکجہتی ہے۔ اس کے بغیر ملک سلامت رہ سکتا ہے' نہ حکومت۔ کوئی نہایت ہی نادان ہندوستانی ہو گا جو اس بات کو نہ سمجھے۔ اور حکومت کی جانب سے اب ان لوگوں کو شہہ نہیں ملتی جو مذہب کے نام پر لوگوں کو لڑانا چاہتے ہوں۔ عوام میں یہ جذبہ نہ ہونا خوش آئند ہے' کیونکہ وہ محفوظ اور خوشحال زندگی پسند کرتے ہیں۔ ایسی زندگی کو معرض وجود میں لانے کی خاطر پیداوار بڑھانے کے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے' مذہبی نعروں کی نہیں۔ اور اسی سمت میں ہماری حکومت ہمیں بلا رہی ہے۔

لیکن اگر منافعوں کے ذخائر بڑی توندوں میں جمع ہوتے جائیں تو پیداوار میں اضافوں سے کیا فائدہ؟ اس ذخیرے کی تقسیم جمہوری اور اشتراکی انداز سے ہونا لازمی ہے۔ ہماری حکومت اس حقیقت کو تسلیم کرتی اور اس کے مطابق اپنے پروگرام ترتیب دیتی ہے۔ یہ بھی بڑے فخر کی بات ہے۔

پردیس میں بیٹھ کر میرے دل میں پنڈت نہرو کے لئے بڑا احترام اور عقیدت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ وہی ان اصولوں کے بانی ہیں۔ وہ نظریات کو علمی اور معاشی ڈھنگ سے دیکھتے ہیں' عمل کی فائدہ مند راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اپنے عوام کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر دھیرے دھیرے آگے قدم اٹھاتے ہیں' بے مقصد چھلانگیں نہیں لگاتے۔ اسی باعث وہ عوام کے دلوں میں آباد ہیں۔ ان کی خاطر لوگ ان کی حکومت کے بھی سو گناہ معاف کر دیتے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں جوں جوں روشن خیالی پیدا ہو گی' ان کے بنائے ہوئے اصول اور بھی مضبوط ہوتے جائیں گے۔ وہ زمانے کی طلب ہیں۔

پاکستان بھی ایشیاء کے نو آزاد ممالک میں سے ایک ہے۔ اس کے قیام میں مذہب کا کتنا ہی ہاتھ رہا ہو' ترقی کے لئے اسے بھی عوامی اور سوشلسٹ اصول اپنانے پڑیں گے' جیسے کہ مصر' الجیریا' وغیرہ مسلمان ممالک نے کیا ہے۔ ملک سے غربت' جہالت' بیماری' ظلم و ناانصافی کو دور کرنے سے بڑی عبادت اور کون سی ہو سکتی ہے؟

پھر خیال آیا' کہ اے دل تو سیاست کے داؤ پیچ کیا جانے! کیا بھارت میں موجودہ بندر بانٹ اور ظلم کی کوئی کمی ہے؟ کیا ملک کا بٹوارہ بذات خود نہرو کی اور ہماری قومی تحریک کی نیج نہیں تھا؟ اگر پھر کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے' تو کیا گارنٹی ہے کہ نہرو یا اس کی حکومت بھارت کی یکجہتی کو قائم رکھ سکے گی؟ اخبارات کی شہہ سرخیاں بتاتی ہیں کہ چینیوں کے ساتھ کشیدگی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اگر خدانخواستہ جنگ چھڑ گئی؟ کہیں پھر' ہمیشہ کی طرح' ہمارے ملک کا اتحاد ریزہ ریزہ تو نہیں ہو جائے گا؟......

میرے لطف کی گرم سی دھوپ پر بادل سے چھانے لگے۔ بھیرے شہر سے تب کی یادیں وابستہ تھیں جب زندگی میں کسی قسم کی مشکل درپیش نہ تھی۔ جھنگ اور سرگودھا پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اب میں ایسے علاقے میں داخل ہو رہا تھا جو اچھی اور بری' راحت رساں اور دکھ انگیز' دونوں طرح کی یادوں سے بھرا پڑا تھا۔ کتنے دنوں سے تڑپ رہا تھا پوٹھوہار کی دھرتی کے درشن کو! کب میں اپنا پنڈی شہر دیکھوں گا؟..... شاہ چن چراغ کی گلی' جہاں میں پیدا ہوا۔ چھاچھی محلہ جس کی گلیوں اور نالیوں میں کھیل کھیل کر بڑا ہوا۔ میرا ڈی۔ اے۔ وی کالج' کمپنی باغ جہاں ہاکی کھیلتے تھے' تاپن' سفید دوکانیں' لنڈا بازار' تکواڑوں کا بازار' صدر کا پل......

لیکن اب جب وطن کی دہلیز' پہ آکھڑا ہوا تھا' تو اس سے ڈرنے لگا۔ سارا شوق کہیں کھو گیا محسوس ہوتا تھا۔ دنگا فساد کی آشفتگیاں یاد آنے لگیں' اللہ اکبر' اور ہر ہر مہادیو' کے نعرے کانوں میں گونجنے لگے' آنکھوں کے سامنے چہروں کا خوف اور سنگینی گھومنے لگی۔

دہلی میں ایک پیارے دوست نے فرمائش کی تھی کہ جب جہلم کے پل سے گاڑی گذرے تو ان کی جانب سے چاندی کا ایک روپیہ دریا کی نذر کر دوں۔ تقسیم کے دنوں میں یہی پانی ان کے خاندان کے کئی افراد کے خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ جہلم سے بھاگ کر دہلی

پہنچنے تک ان پر کیا کیا بیتی' جب بھی میرا دوست وہسکی یا بیئر کا گھونٹ بھر لے' تو دوہرانے لگتا ہے۔ ہم اکثر تنگ آ جاتے ہیں' لیکن اگر سننے لگ جائیں تو ہر مرتبہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہی لوگوں نے اپنی بیٹیوں' بہنوں کو کمروں میں بند کر کے اپنے ہاتھوں سے جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔

اس زمانے میں میں بمبئی بیٹھا بے فکری سے فلموں کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ گھر والے کشمیر میں تھے۔ اجڑے ہم بھی' قبائلیوں کے حملے کے وقت خطرے سے دوچار بھی ہوئے' لیکن اس کے باوجود لاکھوں سے بہتر رہے۔ اگر میں بھی قافلوں کے ساتھ روانہ ہوا ہوتا' اپنی آنکھوں سے بربریت بھرے قتل عام کو دیکھا ہوتا تو کیا جی چاہتا کبھی اس طرف دوبارہ آنے کو؟......

میرا دوست کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن وطن پھر بھی اسے پیارا ہے۔ میرے ہاتھوں سے دریا میں روپیہ پھکوا کر جیسے وہ پیغام بھیج رہا ہو' اپنے نہ آسکنے پر معافی مانگ رہا ہو۔

"واپی" بروقت آگئی' ساری کی ساری سبز رنگ کی۔ لیکن اس کے باعث ماحول ایک دم اجنبی ہو گیا۔ قلی نے میرا سامان فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ سرگودھا سے لالہ موسیٰ تک کمپارٹمنٹ میں اکیلا تھا۔ لیکن اب ایک ہمسفر ساتھ تھا۔ پاکستان فوج کا ایک نوجوان کپتان' دوسرے سرے پر کھڑکی کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا۔

جوں جوں جہلم نزدیک آتا جا رہا تھا میں جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے بھارتی روپے کو مسلتا جا رہا تھا۔ افسر کے ساتھ میری گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی' لیکن کبھی کبھی وہ نظر بھر کر میری جانب دیکھ لیتا۔ میرے اپنے ہی علاقے کا آدمی تھا' گورا چٹا اور قد آور' شاید ہزارہ کا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے بات چھیڑنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ لیکن اگر اس نے مجھے دریا میں روپیہ پھینکتے دیکھ لیا تو ہمارے درمیان سارا اچھا ماحول تباہ ہو جائے گا۔ پتہ نہیں اس کے بعد وہ میرے ساتھ کیسے پیش آئے گا؟

آدھا دریا گزر گیا' مجھے ہاتھ جیب سے باہر نکالنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار اپنی طرف سے بہت چھپا چھپا کر میں نے کھڑکی میں آگے جھک کر روپیہ پھینک دیا۔ لیکن وہ تاڑ گیا کہ میں نے کوئی انوکھی حرکت کی ہے۔ میں نے عاجزانہ سے انداز میں' جیسے کسی گناہ کی صفائی پیش کر رہا ہوں' انگریزی میں کہنا شروع کیا' "مجھے ایسی باتوں میں کوئی یقین نہیں' لیکن کسی دوست کا کہنا......"

اس کا چہرہ گمبھیر ہو گیا اور بڑی خوش خلقی سے اس نے سر جھکا کر کہا' "آپ جم جم

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کریں، میں آپ کے جذبات کو سمجھتا ہوں۔"

پل بھر کے لئے یوں لگا جیسے ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں، لیکن اس کے بعد ہم پھر دور ہو گئے، جیسے ریل کی لائنیں پہلو بہ پہلو مگر الگ الگ چلتی ہیں۔ آپس میں مشکل سے دو چار باتیں ہوئیں، جیسے تپتی دھرتی پہ بارش کا قطرہ پڑ جائے۔ زیادہ تر سفر ہم نے اپنی اپنی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے گزارا۔ مجھے اور چاہئے بھی کیا تھا؟ اپنی پوٹھوہار کی دھرتی کے لئے تو آنکھیں ترسی ہوئی تھیں، یقین نہ آتا تھا کہ واقعی آبادیاں اور پہاڑ دیکھ رہا ہوں یا کوئی خواب ہے۔ سکول میں جغرافئے والا ماسٹر پڑھایا کرتا تھا کہ ایسی دھرتی کو سطح مرتفع کہتے ہیں۔ کتنا مشکل تھا یہ لفظ سطح مرتفع۔ لیکن کتنا پیارا تھا۔ آج بھی نہیں بھولا۔ اپنے وطن پر لاگو ہوتا ہے نا۔

ترقی، کا مشہور موڑ گزرا۔ پھر سوہاوہ، مسا، کیسوال، گجر خان پہنچ کر چائے ضرور پیتے تھے، ساتھ ٹھنڈے ابلے ہوئے "آنڈڑے" (انڈے) کھاتے۔ لیکن اس مرتبہ گاڑی رکی ہی نہیں..... کمبخت۔ پہلے تو فرنٹیئر میل بھی ٹھہرتی تھی..... مندرہ، مانک والا، (مانکیالا) سہالہ۔ اب نالہ کرنگ آئے گا..... وہ کتنے انتظار کے بعد آیا اور کتنی جلدی گزر گیا۔ اچھی طرح دیکھا بھی نہ گیا۔ کتنی بے انصافی کی بات ہے، گاڑی کو ذرا آہستہ نہیں چلا سکتا تھا؟..... گاڑی چک لالہ جا کھڑی ہوئی۔ وہ دور پنڈی نظر آ رہا تھا۔ منظر کوئی زیادہ بدلا تو نہیں؟..... یہ آیا مریڑ کا پل، لحظہ بھر میں اس کے نیچے سے مری روڈ گزر گئی۔ یہ پل مجھے تب سے یاد ہے، جب ماں مجھے گود میں اٹھا کر گاڑی کی کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوتی تھی۔ اور میں حیران رہ گیا کہ گاڑی کیسے کوئی جھٹکا کھائے بغیر ایک دم نیچے سڑک پہ اتر کر پھر اوپر چڑھ آئی تھی۔ پھر مجھے زندگی میں ریل گاڑی کا پہلا سفر یاد آیا۔ رات کے وقت گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ بہت لمبا ڈبہ تھا، لمبی سی سرنگ جیسا۔ بہت سے لوگ تھے۔ اچانک ڈبے کی دیواریں دائیں بائیں ہونے لگی تھیں۔ میں ساری رات ڈرتا رہا کہ کہیں گاڑی گر نہ جائے۔ لیکن وہ نہ گری۔ اس کے بعد میں نے اندازہ لگایا تھا کہ گاڑی دائیں بائیں گھسٹ کر آگے سرکتی ہو گی، کیڑے کی طرح۔ مجھے علم نہیں تھا کہ نیچے پہیے لگے ہوئے ہیں.......... یہ آیا صدر کا پل...... آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس پل پہ فارغ کھڑا نیچے شنٹ کرتی گاڑیوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا، سکول میں چھٹی تھی۔ اچانک میرے من میں فلسفے کی ایک لہر اٹھی۔ زندگی ریل گاڑی کے سفر جیسی ہے۔ دن، مہینے، سال سٹیشنوں جیسے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہر اتوار کو اس نقطے کو یاد کر کے اپنی زندگی کا سفر ناپا کروں گا۔ نجانے کیوں میں آج تک

اس ناوان سے فیصلے کو نبھاتا چلا آیا ہوں۔ کئی مرتبہ اسے بھلانے کی کوشش کی ہے، لیکن ہر اتوار کو کسی نہ کسی وقت میرا دھیان اس صدر والے پل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ میں جھنجلاتا ہوں اور ایک انگریزی نظم یاد آتی ہے..........

When as a babe I slept and wept
Time Crept.
When as a boy I laughed and talked
Time Walked.
When I became a full-grown man
Time Ran.
And older as I daily grew
Time few.
Soon I shall find in travelling on
Time gone.

تب زندگی گاڑی کی طرح لگی تو تھی، لیکن یہ خیال نہ آیا کہ اس کا نام، "سپر تیز گام" ہے۔

گاڑی اس پل کے نیچے سے سانپ کی طرح بل کھاتی پنڈی کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر آنگ ملا رہی ہے۔ شام گہری ہو گئی۔ میں بہت بہت دور کے سفر کر کے واپس پنڈی آیا کرتا تھا۔ اس لمحے کو تصور کر کے، جب تانگہ گھر کے دروازے پر جا کر رکے گا، ہر مرتبہ چھلانگیں لگانے لگتا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر پتا جی کے دفتر میں جا گھسوں گا اور وہ ہکا بکا ہو کر، خوشی سے کھل کر، کرسی سے اٹھ بیٹھیں گے... "اوئے بلراج تو آ گیا؟"

اور پھر وہ خود نوکر کو آواز دیں گے اور باہر جا کر تانگے والے کو پیسے ادا کریں گے۔

انہیں علم تھا کہ بیٹے کو جیبیں خالی کر کے ہی گھر واپس آنے کا شوق ہے........

اب اس شہر میں کوئی میرا انتظار کرنے والا نہیں۔ مجھے گھر نہیں جانا، کسی ہوٹل میں ڈیرہ جمانا ہے:

"شہر والیوں! اپنے شہر
اندر اسی آئے ہاں وانگ پردیساں دے۔"

(شہر والو! ہم اپنے شہر میں پردیسیوں کی طرح آئے ہیں۔ مترجم)

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

12

میں گاہے بگاہے اپنے پروگرام کے متعلق ڈاکٹر نذیر احمد کو لاہور میں اطلاع دیتا رہتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ میں نے پنڈی کب پہنچنا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے ایک دوست سے درخواست کی کہ مجھے سٹیشن پر لینے آئیں۔

یہ دوست سٹیشن پر آئے ضرور' لیکن نظر آ رہا تھا کہ بہت خوش نہیں ہیں' لیکن پھر بھی میرے لئے ان کا آنا غنیمت تھا۔ پردیس میں پہلا سوال رہائش کا ہوتا ہے اور کسی واقف کی مدد سے یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو جاتا ہے۔

پلیٹ فارم اور ڈیوڑھی کے درمیان اعلیٰ درجے کے مسافروں کے لئے بنی ہوئی سلامی دار گزرگاہ پنڈی سٹیشن کی خاص نشانی ہے۔ عہد طالب علمی میں' سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ جیب میں ہوتا تو بڑی شان کے ساتھ اس میں سے گزرتا تھا۔ آج میں آہستہ آہستہ اس کی پتھر کی درزوں پر قدم رکھ رہا تھا' کہ کہیں انہیں ضرب نہ لگے۔ باہر ایک چھوٹی سی ٹیکسی میں سامان رکھوایا اور دونوں بیٹھ گئے۔ انہوں نے رسمی خلوص سے کہا' "آپ فلیش مین ہوٹل میں ٹھہرنا پسند فرمائیں گے۔ میں نے دوپہر کو فون پر ان سے بات کی تھی' اس وقت کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ لیکن میرے خیال میں اب پھر چل کر پوچھ لیتے ہیں۔"

میں نے ہاں تو کر دی' لیکن اندر سے میرا وہاں رہنے پر بالکل دل نہیں تھا۔ ایک تو میری مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ دوسرے' میرے دور میں' جب صدر صرف ہوا خوری کے لئے جایا کرتے تھے' اس ہوٹل میں بڑے رعب دار قسم کے انگریز افسر رہا کرتے تھے۔ تیسرے' پچھلے پانچ سات دن سے میں گلیوں' محلوں اور سراؤں میں ٹھہرتا آیا تھا۔ عام لوگوں سے میل ملاقات اور آزاد گفتگو کا بھرپور موقعہ ملا تھا' جو فلم ایکٹر ہونے کے صدقے ہندوستان میں نصیب نہیں تھا۔ جب تک ممکن ہو سکے میں بڑائی کی قید سے آزاد رہنا چاہتا

تھا۔ لیکن ان کے ٹھنڈے ٹھنڈے سلوک کی وجہ سے میں کھل کر بات کرنے کے قابل نہ ہوا۔

اچانک ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے منہ کر کے کہا "جی معاف کرنا" آپ بلراج ساہنی تو نہیں؟" میں نے سوچا کسی اخبار میں اس نے میرا ذکر پڑھا ہو گا۔ روز ہی تو بڑی محبت کے ساتھ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ چھاپا جاتا ہے' یا ہو سکتا ہے اس نے میری کوئی فلم دیکھی ہو۔ لیکن بات کچھ اور نکلی۔

"ہاں بھائی ہوں تو وہی۔" میں نے کہا۔

"اور میرا نام خورشید ہے۔ مجھے نہیں پہچانا؟"

میرے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اندھیرے میں اس کے چہرے کو پہچاننے کی بڑی کوشش کی' لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن خود بخود منہ سے نکل گیا' "کون سا خورشید؟ کہیں تم غنی کے بھائی تو نہیں ہو؟"

"وہ نہیں تو اور کون ہوں۔ خدا کی قسم' بڑا پکڑا ہے۔" وہ زور سے ہنسا۔

"فلیش مین ہوٹل چلیں" میرے ساتھی نے اسے اردو میں اپنے فرض سے آگاہ کیا۔ خورشید نے گاڑی چلا دی' لیکن سلسلہ گفتگو بند نہ کیا' "چلیں نا آپ کو گھر لے چلوں۔ ہوٹل میں ٹھہریں گے تو ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہو گی۔"

"تم غم نہ کرو۔ کل صبح میں نے چھاچھی محلے آنا ہے' پھر بات کروں گا۔ ابھی یہیں ہوں چار پانچ دن۔"

"قسم ہے خدا کی سچ کہہ رہا ہوں' اگر کسی کو پتہ لگ گیا کہ آپ کو ہوٹل چھوڑ آیا ہوں تو مار مار کر مجھے ادھ موا کر دیں گے۔"

"میں ذمہ داری لیتا ہوں......"

خوش قسمتی سے ہوٹل فلیش مین کے کاؤنٹر پیچھے کھڑے کلرک نے پھر ٹھینگا دکھا دیا' لیکن گفتگو کے دوران اس کی نظر میرے چہرے پر پیوست ہونے لگی۔ میں اس خطرے کی علامت سے خوب واقف تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ اپنے انکار کو واپس لینے کا سوچتا میں اپنے ساتھی کا بازو پکڑ کر باہر کی طرف چل دیا۔

دوسرے نمبر کا ہوٹل تھا میٹروپول۔ اس میں ایک گزارے لائق اچھا کمرہ مل گیا۔ میرے مہمان صبح نو بجے پھر آنے اور مجھے سیکورٹی آفس لے چلنے کا یقین دلا کر رخصت ہو گئے۔ لیکن ان کے چہرے سے مجھے شک ہوا کہ شاید نہ ہی آئیں۔ لیکن خورشید کے آنے کا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مجھے پورا یقین تھا۔ اور مجھے چاہیے بھی کیا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے ہوٹل کے وسیع احاطے میں، چیڑھ کے اونچے لونچے درختوں تلے، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر کافی دیر ٹہلتا رہا۔ سرسراتی ہوئی ہوا کبھی مجھے ایبٹ آباد اور کبھی کوہ مری کے قصے سنانے لگتی اور میں نے آہ بھر کر کہا "ہائے او پنڈی! تو اتنا خوبصورت نہ ہوتا تو تجھے بھلانا شاید آسان ہوتا۔"

رات کو برے خواب آتے رہے۔ ایک تو بہت ہی بھیانک تھا۔ یہ کہ میں ہوٹل میں نہیں بلکہ اپنے چھاچھی محلے والے گھر میں جا ٹھہرا ہوں۔ میرے پڑوس کے پرانے دوست بوستان نے ہمارے گھر والوں کے کبھی نہ کبھی واپس لوٹ آنے کے انتظار میں کسی مہاجر کو اس میں آباد نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے ہمارے گھر کا سارا سامان، جو ایک زمین دوز گودام میں محفوظ تھا، بالکل ویسے کا ویسے واپس رکھوا دیا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں نے بڑے شوق سے اپنے کتابوں والے کمرے کو نئے سرے سے سجایا۔ پڑھنے والی کتابوں کی فہرست بنائی۔ لکھنے کا پروگرام طے کیا اور آئندہ کے لئے فیصلہ کر لیا کہ سال میں کم از کم چھ ماہ یہاں گزارہ کروں گا۔ پھر میری ایک ایسے دوست سے ملاقات ہوئی جسے بالکل بھول چکا تھا۔ اس کا جسم کپاس جیسا سفید اور نہایت نرم ہوتا تھا۔ سکول میں ماسٹر اسے تھپڑ مارنے سے ڈرتے تھے کیونکہ سارا دن انگلیوں کے نشان اس کی گالوں پر نقش رہتے تھے۔ اس نے مجھے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی، جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ بڑی شاندار دعوت دی اس نے، لیکن آخر میں بھری محفل میں چھرا نکال کر یہ کہتے ہوئے میری چھاتی میں گھونپ دیا کہ "وہ بھی میرا فرض تھا اور یہ بھی میرا فرض ہے۔" بوستان، بخشا، مرتضٰی خان اور دیگر کئی دوست وہاں موجود تھے، لیکن کسی نے بھی اس کا ہاتھ نہ روکا......

اس احمقانہ خواب کے باعث دل کو آزردگی کی بجائے خوشی سی محسوس ہوئی کہ ایک بھولے بسرے دوست کی یاد اتنے عرصہ بعد اچانک تازہ ہو گئی۔ پہلی سے بارھویں تک ہم اکٹھے ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ میری ماں میرے سب دوستوں میں سے اسے سب سے زیادہ پیار کیا کرتی تھی۔ ہم اکٹھے پڑھتے، اکٹھے کھیلتے۔ کبھی وہ ہمارے گھر میں سو جاتا اور کبھی میں اس کے گھر۔ اس نرم خو اور نازک شخص کا خواب میں بھی کسی کو چھرا گھونپنا انہونی بات تھی، لیکن اس سے بھی انہونی اور ناقابل معافی بات تھی میرا اس کو یوں مکمل طور پر بھول جانا۔ گذشتہ بیس پچیس برس کے دوران کبھی ایک مرتبہ بھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد میں نے لاہور میں داخلہ لے لیا اور وہ فوج میں بھرتی ہو کر

کسی غیر ملک چلا گیا۔ اب کہاں ہو گا وہ؟ نام کیا تھا اس کا؟ جب لگاتار کوشش کے باوجود مجھے اس کا نام یاد نہ آیا تو میں بہت جھنجلایا۔ کیا اس مرتبہ میں اسے مل سکوں گا؟ کتنی خوب صورت پگ باندھتا تھا وہ—— بالکل پنڈتوں والی۔ کیسے ڈھونڈوں گا اسے، جب کہ اس کا نام بھی یاد نہیں؟

صبح آنکھ جلدی کھل گئی۔ منہ اندھیرے، کھلی کھڑکی والا یہ کمرہ کوہ مری کی ایک کوٹھی کی یاد دلا رہا تھا۔ ٹھنڈ بھی تو اچھی خاصی تھی، جیسے سچ مچ کسی ہل سٹیشن پر آگیا ہوں۔ اب طوطوں کی بجائے بلبلیں نغمہ زن تھیں۔ اجالا پھیلتے وقت چڑیوں کے شور کا طوفان آگیا۔ کل تک اوپر لینے کو بس ایک کمبل کافی تھا۔ آج اس کے ساتھ دھسا (دو تہوں والی اونی چادر) بھی جوڑنا پڑا جو ڈاکٹر نذیر نے بطور خاص پنڈی کے لئے عنایت کیا، اور کھیس بھی۔ رضائی ہوتی تو اور بھی مزہ آتا۔

جنوری فروری کے دوران پنڈی میں کہرا جم جاتا۔ کسی کسی سال برف بھی پڑتی اور سارا شہر جشن مناتا۔ کاش میں وہ موسم بھی دیکھ سکتا۔

پتا جی شدید سردی میں بھی ہمیں صبح چار بجے جگا دیتے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہانا پڑتا۔ ہاتھ پاؤں برف ہو جاتے اور پھر ہم رضائی میں گھس کر پڑھتے۔ پڑھتے پڑھتے پھر سو جاتے۔

میں بستر کی گرمائش کو تیاگ کر غسل خانے میں جا گھسا اور ٹھنڈے پانی سے غسل کیا، لطف آگیا۔ پھر کپڑے پہن کر مال کی سیر کو نکل پڑا۔ لیکن پہلے وقتوں والی مسرت نصیب نہ ہوئی۔ ابھی سکیورٹی آفس اور پولیس سٹیشن میں اندارج نہیں کروایا تھا۔ پتہ نہیں میرا ہوٹل سے باہر نکلنا جائز تھا یا ناجائز؟ اردگرد اجنبی نظروں سے دیکھنا مجھے ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ ملکہ کے بت تک گیا اور بھی آگے جانے کو دل چاہا۔ ٹوپی پارک تک ہو آؤں، لیکن ہمت نہ ہوئی۔ واپسی پر دیکھا کہ شہر سے لال کرتی کے محکموں میں کام کرنے کے لئے جانے والے لوگوں کی ٹولیاں سڑکیں پار کر رہی ہیں۔ موڑ پر ایک دہلی یوپی والے علاقے کا فقیر بے پناہ رسیلی اور چست اردو میں اللہ و نبیؐ کے نام پر بڑی کامیابی سے نرم دل پنجابیوں کی جیبیں تاڑ رہا تھا۔

ہوٹل میں واپس آگیا۔ ابھی آٹھ نہیں بجے تھے۔ احاطے میں ایک جگہ راج مزدور مرمت کا کام کر رہے تھے۔ راجوں کے ہتھیار بچپن میں میری من پسند کھیل تھے، لیکن اب مجھے ان کے نام بھول چکے تھے۔ میں نے قریب جا کر نام پوچھے۔ تیسی، کانڈی۔ مستری اوب

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سے کھڑا ہو کر مجھے "صاحب" "صاحب" کہنے لگا۔ اس نے دل میں سوچا ہو گا "ان بڑے لوگوں کے بھی عجیب مشغلے ہوتے ہیں' بھلا ان اوزاروں کے نام پوچھ کر اس نے کیا لینا ہے؟" دل بہت دکھی ہوا۔ اس مستری کا درجہ میری نظر میں بادشاہوں جیسا تھا' کیونکہ اس کے پاس اپنا وطن تھا' اور میرا ایک فقیر سے بھی نچلا۔ "صاحب' صاحب" کہہ کر جیسے وہ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔

کوئی چار برس کا تھا جب چھاچھی محلے میں ہمارا گھر تعمیر ہوا۔ مستری کریم بخش نے بنایا تھا اور ہم اسے ہمیشہ "چاچا جی" کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کا گھر بھی ہمارے محلے میں تھا' شاہ کی نابلیوں والی گلی میں۔ ایک مرتبہ میں بندروں کی طرح ہاتھوں پیروں کے بل اپنے اوپر والے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا' چاچے کی کوئی ڈیڑھ سالہ بچی گلزار راستہ روکے بیٹھی تھی۔ اچانک مجھے اس پر اتنا پیار آیا کہ میں نے اس کی ٹانگ پر زور سے دانت کاٹ لیا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں' اور مجھے بہت مار پڑی۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ میں نے خواہ مخواہ اسے کیوں کاٹ کھایا؟ بہت شرم آتی ہے' اس قصور کو یاد کر کے۔ اس کا بھائی غضنفر علی' جسے سارا محلہ غزنی غزنی کہتا تھا' میرا ہم عمر تھا۔ وہ کہاں ہو گا آج کل؟

کمرے کی طرف واپس آتے ہوئے وارث شاہ کی کچھ سطریں یاد آ گئیں:

حکم پاک اللہ دا من لیئے' وارد ہو جاوے تقدیر جتھے
اوتھے دانشمند حیران ہوندے' پیش جائے نہیں تدبیر جتھے
حکم نبیاں نبیاں اولیاں نے' تابع ہوئے پیر فقیر جتھے
گھر ایہو ہے مہر دا جوگیا وے' سیدے ویاہ کے آندڑے ہیر جتھے
رو رو کے اج توں کڈھنی ایں' تک نال حدیث لکیر جتھے

ٹھیک نو بجے خورشید ٹیکسی لے کر گھر آ گیا۔ میں ڈائننگ روم میں سے نکل رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اس قدر گہری تعظیم کے ساتھ نمستے کیا کہ میری ہنسی نکل گئی "سنا بھئی خورشید! کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہوں جی۔"

وہ بڑے حسین سے تذبذب میں پھنسا ہوا تھا۔ ایک جانب وہ ٹیکسی ڈرائیور' ساتھ عمر میں بھی چھوٹا۔ دوسرے جانب میں اس کا محلے دار' اس کے بڑے بھائی کا دوست۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ ادب آداب وہ زیادہ دیر تک نہیں نبھا سکے گا۔

میں نے کہا' "وہ صاحب نہیں آئے ابھی۔ انتظار کر لیں ذرا؟"

"ہاں انتظار کریں نا۔"

"تم نے میٹر نیچے نہیں کیا۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ اسے نیچے کر لو۔"

"ہو گا نہیں جی۔ کچھ خرابی ہے۔"

"میں کر دوں؟"

"کریں نا۔ اگر ہو جائے تو بڑا ہی ماور......" یہ کہتے ہوئے وہ بونٹ کے پاس سے ہٹ کر گاڑی کے پیچھے چلا گیا' جیسے منہ سے گالی نکلنے پر شرمندہ ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا' "چلو' چائے پئیں۔"

اور میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ آدھ گھنٹے بعد ہم کار میں ساتھ ساتھ بیٹھ کر سکیورٹی آفس روانہ ہو گئے۔ تکلف کے تمام ضابطے ٹوٹ چکے تھے۔ سارا رستہ بے جھجک ہو کر وہ اس دوست کا مذاق اڑاتا رہا' جو وعدہ کرنے کے باوجود نہیں آیا تھا۔

"میں تو رات کو ہی محسوس کر رہا تھا' اس بندے دے پتر کی زبان کچھ اور کہہ رہی ہے اور دل کسی اور جانب لگا ہے۔ صاحب بہادر کی ٹوپی نہیں دیکھی تھی؟ کیسے کانوں پر کھینچ رکھی تھی' نیچے سے آدھا منہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہمیں پتہ ہے جی ساری بات کا۔ وہ ڈرتا ہے کہ آپ کے ساتھ گیا تو سی۔ آئی۔ ڈی میں اپنا نمبر بھی نوٹ ہو جائے گا۔ رات کو پتلون گر گر پڑتی تھی۔ ادھر ادھر دیکھ کر اونچی کر رہا تھا۔"

"چل یار' کوئی بات نہیں۔ کچھ تو مدد کی ہے نا۔"

اس کی باتوں میں ایسا لطف آ رہا تھا جیسے اسے ملنے کے مقصد کے تحت ہی میں پاکستان آیا ہوں......

"جیم جیل خانہ پنڈی روڈ والا" ایک مشہور اور مقدس جگہ ہے۔ آزادی کے ان گنت نامور اور گمنام پروانوں نے اس کی چار دیواری میں اذیتیں جھیلی ہیں' جو ذکر کرنے کے قابل شعروں اور بولیوں میں درج ہیں۔ اس کے پھاٹک کی طرف سے عدالت کی پیشی کے لئے ہتھکڑیاں لگے اور پابجولاں ملزمان کی دو مساوی قطاریں چلتی آ رہی تھیں۔ اردگرد سپاہیوں کے علاوہ ان کے گھر والے مردوں عورتوں کی بھیڑ تھی۔ دیہاتی لوگ تھے یہ' سفید لٹھے کی چادریں لینے والے اونچے لمبے اور حسین۔ میرا ویزہ دیہات میں جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کچھ حد تک آنکھوں کی بھوک مٹانے کی خاطر میں اس جلوس کا انتظار کرنے لگا۔ ایک قد آور عورت' جو موہن سنگھ کی نظم "کڑی پوٹھوہار دی" کی مجسم تصویر تھی—— صبر صدق

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کی مورت۔۔۔۔ آنکھوں سے چپ چاپ ٹپ ٹپ آنسو بہاتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئی، جیسے کہہ گئی ہو، "تو نے میرے دکھ نہیں بانٹے ویرا! لیکن کوئی بات نہیں، جیتا رہ!"

اس سکیورٹی آفس کا اور جن میں اب تک پیش ہوتا آیا تھا زمین آسمان کا فرق تھا۔ سجا سجایا کمرہ، آمنے سامنے بچھی آرام کرسیوں کی قطاریں، ایک کونے میں افسر کی میز، اس پر فائلوں کے ڈھیر نہیں تھے اور نہ ہی اردلیوں اور کلرکوں کی بھگدڑ۔ افسر نے دو یورپین عورتوں کو خوش خوش رخصت کر کے میری جانب دھیان کیا۔ پاسپورٹ دیکھ کر، بڑی نرمی سے مجھ سے اجازت مانگ کر، تقریباً" پانچ منٹ کے لئے کمرے سے باہر چلا گیا۔ ضرور میری فائل منگوا کر پڑھی ہو گی۔ کارروائی تو ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے، لیکن افسروں کا سلوک شہروں کی بڑی یا چھوٹی حیثیت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

واپس آ کر اس نے ضروری اندراج کرانے کے بعد پاسپورٹ لوٹا دیا۔ پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر کہنے لگا "مجھے امید ہے کہ یہاں اپ کا قیام بڑا اچھا رہے گا۔"

"کیا پولیس سٹیشن نہیں جانا پڑے گا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیوں؟ وہ کس لئے؟"

"اب سے پہلے تک تو مجھے ہمیشہ دو جگہوں پر جانا پڑا ہے۔"

"اچھا؟ یہ تو خوامخواہ کی تکلیف ہے۔ نہیں اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں واپسی پر پھر ایک مرتبہ یہاں آنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی آپ کو؟"

"لیکن میں نے کوہ مری بھی جانا ہے۔ میرا ویزہ ہے وہاں کا۔"

"آپ بڑی خوشی سے کوہ مری جائیں۔"

"لیکن جانے سے پہلے یہاں آنے کی....."

"کوئی ضرورت نہیں۔"

"وہاں پہنچ کر؟"

"اگر وہاں رات رہنا ہے تو پولیس سٹیشن میں رپورٹ کرنی پڑے گی، ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہاں راولپنڈی میں کوئی بندش؟"

"کوئی بندش نہیں۔"

"میں ٹوپی پارک جا سکتا ہوں؟"

"بڑی خوشی سے۔"

"سوہاں؟"

"وہ ذرا دور ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"پنڈی آ کر میں سوہاں نہ دیکھوں؟" اس کے اچھے سلوک نے مجھ میں دلیری پیدا کر دی تھی۔

"اچھا دیکھ آئیں سوہاں بھی۔ لیکن پل سے پار نہ جانا۔"

"تھینک یو ویری مچ" میں نے شکر گزاری کے ساتھ پھر اس سے ہاتھ ملایا اور باہر آ گیا۔

جیسے ہلکا سا پھول ہوا میں اڑتا ہے، کچہری میں سے گزر کر میں ٹیکسی سٹینڈ پر جا پہنچا جو کسی زمانے میں مکمل طور پر تانگہ سٹینڈ ہوتا تھا۔ خورشید میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے کہا، "خورشید، لگے ہاتھ ٹوپی رکھ اور سوہاں کا چکر لگا آئیں، پھر شہر چلیں گے۔"

"ٹھیک کہا ہے۔"

ٹوپی رکھ کر نام اب ایوب پارک ہے۔ کنول کے پھولوں والی جھیل کے اوپر والی طرف پیویلین اور ریستوران بن گیا ہے۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔ خورشید جان گیا تھا کہ میں اس کی باتیں بڑے شوق سے سنتا ہوں۔ ہر چیز کو کھیل تماشا کے ڈھنگ سے دیکھنا پنجابی مزاج کی خصوصیت اور پنڈی والوں کے مزاج کی خاص خصوصیت ہے۔ مثلاً" پارک میں ایک ٹیڈی بوائے کو چست پتلون پہنے گھومتا دیکھ کر خورشید بولا "لیں، یہ دیکھیں، سارنگی پر غلاف چڑھایا ہوا ہے..... یہ گھس تو گیا اس باپ والی پتلون میں، لیکن نکلے گا کیسے؟"

چوراہوں پر ٹریفک پولیس والوں کو سفید سولا ہیٹ، سفید بوٹ، وردی اور دستانے پہنے کھڑا دیکھ کر اس نے کہا، "یہ دیکھیں، چونے میں کوا پھنسا ہوا ہے۔ ان کی نئی وردیاں بنوائی گئی ہیں۔ ٹوپیاں غلطی سے ایک ہی سائز کی نکل آئی ہیں۔ کسی کو پوری آتی ہے، کسی کو نہیں۔۔۔۔ ذرا اسے دیکھیں، دیکھا ہے؟"

اور اب وہ پاکستانی فلموں کا ذکر لے بیٹھا تھا۔ لاہور کے کسی سٹوڈیو میں جا کر ایک مرتبہ شوٹنگ دیکھ آیا تھا۔ اس نے وہ سارا منظر تفصیلاً" بیان کیا اور مجھے ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ کہنے لگا۔۔ "اوہیں ای حرام زادیوں نے کھا کھا کر پیٹ موٹے کیے ہوئے ہیں۔ فلم بنانی تو ان میں سے کسی کو آتی ہی نہیں۔ فلم کا کام ہوتا ہے جھوٹ کو سچ بنا کر دکھانا۔ یہ سچ کو بھی جھوٹ بنا کر دکھاتے ہیں!"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پھر اترائیاں اتر کر ہم سوہاں کے کنارے جا بیٹھے۔ دریا کو دیکھ کر ہم دونوں پر سکتہ سا چھا گیا۔

مجھے پرانے وقت یاد آئے۔ تب چھاچھی محلے میں صرف ہمارا گھر اور اس کے سامنے چھابھیوں کی بڑی سی حویلی ہی دو پکی عمارتیں تھیں۔ باقی ہر طرف کچے کچے کوٹھے تھے جیسے گاؤں میں ہوتے ہیں۔ تب پنڈی سے کشمیر مال برداری کرانچیوں (بیل گاڑیوں) کے ذریعہ ہوتی تھی۔ یہ چھابھیوں کا پیشہ تھا۔ بیل گاڑیوں کے لمبے لمبے قافلے چلتے۔ ہمارے محلے میں گھر گھر بیلوں کی گھنٹیاں سنائی دیتیں۔ یہ چھاچھی مسلمان بیلوں کو اپنے اہل خانہ کی طرح پیار کرتے۔ کوئی بیل مر جاتا تو عورتیں دھاڑیں مار مار کر روتیں اور پیٹتیں۔ خورشید اور اس کا بڑا بھائی غنی بھی چھابھیوں کی اولاد تھے۔

جنگ عظیم اول کے بعد چھابھیوں کے کچے کوٹھے گرنے لگے اور ان کی جگہ پکے مکان بننے شروع ہو گئے۔ پہلے محلے میں بمشکل ایک دو گھر ہندوؤں کے تھے' اب کافی سارے ہندو آ گئے۔ پھر لاریوں کے آنے سے بیل گاڑیوں کا کاروبار ختم ہو گیا اور چھاچھی آہستہ آہستہ سارے محلے میں سے غائب ہوتے گئے۔ غنی کا باپ موٹر چلانے لگا تھا۔ بڑا اچھا ڈرائیور مانا جاتا تھا۔ پتہ نہیں موٹر اس کی اپنی تھی یا نوکری کرتا تھا' مجھے معلوم نہیں۔ اس کا خاندان ہمارے گھر کے سامنے والی بڑی حویلی میں رہتا تھا اور بھی کئی خاندان آباد تھے۔ زیادہ تر نے بیل گاڑیاں چھوڑ کر تانگے چلانے شروع کر دیے۔ غنی میرے ساتھ آریہ سکول میں چار پانچ جماعتیں پڑھا۔ پھر اس کے باپ نے اسے چک لالہ ایم۔ ٹی ورکشاپ میں بھرتی کرا دیا۔ اس کے بعد ہم زیادہ نہیں ملے۔ یہ خورشید' غنی سے آٹھ دس سال چھوٹا' میرے بھانجے اشوک کے ساتھ کھیلنے ہمارے گھر آنے جانے لگا تھا۔ میں لاہور چلا گیا' وہاں سے شانتی نکیتن' وہاں سے سیواگرام۔ جب بھی میں پنڈی کا چکر لگاتا تو غنی مجھے بڑے پیار سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس چھوٹے خورشید کو تو مجھ پر بے انتہاء مان تھا' چاہے میں اسے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ بی۔ بی۔ سی کی نوکری اور میرے ولایت جانے کے بعد غنی وفات پا گیا تھا۔ میں ولایت سے واپس کر آ کر بمبئی میں رہنے لگا اور پنڈی کا باب بند رہا...

"یہ دیکھیں"" اچانک خورشید کی آواز سن کر میں چونک اٹھا' "آ گئے ہیں۔"

اس کا اشارہ دور ایک ٹیلے پر کھڑے ہوئے سی۔ آئی۔ ڈی کے دو آدمیوں کی طرف تھا' جو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کباب میں ہڈی والا کردار ادا کرنے ہمارے پیچھے آ گئے تھے۔

13

اپنے پرانے مکان کے درشن کرنے جاتا ہوں۔ لیکن اخبارات کے فوٹوگرافر مجھ سے پہلے وہاں موجود ہیں۔ محلے میں تماشا سا بن جاتا ہے۔ جی بھر کے مکان کو دیکھنے کی' اسے اپنے حال سنانے کی' اس کے حال پوچھنے کی حسرت تنہائی میں ہی پوری ہو سکتی تھی۔ بہت مرتبہ منت کی' لیکن یہ تنہائی نصیب نہ ہوئی....

مکان کے نئے مالک جالندھر والی طرف کے ہیں' بہت ہی شریف' ملنسار' عاجز۔ پردہ نشین ہونے کے باوجود عورتوں نے مجھ سے پردہ نہ کیا۔ بڑے احترام سے چائے پیش کی' کمروں کا چکر لگوایا۔ ہمارا فرنیچر اسی ترتیب سے پڑا تھا جس میں ہم رکھتے تھے۔ مکان سے محروم ہونے کا رنج بالکل محسوس نہ ہوا' لیکن اس فرنیچر کو دیکھ کر دل میں شدید بخیلانہ حسد جاگ اٹھا۔ دل چاہا کہ ساری چیزیں اٹھا کر لے جاؤں۔

ایک پرانے محلے دار کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ بارات کو ہمارے گھر کے نچلے حصے میں کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ برتانے والوں میں میں بھی شامل ہوں۔ میزیں کرسیاں اندر صحن میں پتا جی کے دفتر میں' اور اس کے پیچھے میرے اپنے سلیپنگ روم میں بچھی ہوئی ہیں۔ وقت عجیب ہلارے لے رہا ہے۔

"وارث شاہ میاں مزہ چکھ سارا' مزے دکھ نے پوریاں پوریاں دے"

بارات کو کھانا کھلا کر دوستوں کی منڈلی خود کھانے بیٹھتی ہے۔ اچانک وہ دوست بھی پہنچ جاتا ہے جس نے خواب میں مجھے چھرا مار کر ہلاک کر دیا تھا اور جس کا نام مجھے اب تک یاد نہیں آیا تھا۔ ہو بہو خواب کے انداز میں ہی ساتھ ساتھ بیٹھ کر ہم کھانا کھانے لگے۔ میرے منہ سے نکل گیا' "یار میری بدنصیبی دیکھ' تیرا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔"

ایک دم اس کا ہاتھ لگائے میلا ہونے والا گورا چہرہ غصے کے مارے تمتما اٹھا' جیسے ابھی

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

جیب میں سے چھرا نکال کر خواب کو مکمل حقیقت بنا دے گا۔ اس نے چھرا تو نہیں نکالا' لیکن جو لفظ کہے وہ کم تیز دھار نہ تھے: "واپس جا کر اپنی ماتا جی سے پوچھنا۔ انہیں میرا نام نہیں بھولا ہو گا۔"

دلی پہنچ کر میں نے اس بات کو آزمایا۔ میں نے ماں سے کہا' "ماتا جی میرے بچپن کا وہ دوست یاد ہے؟ بہت شریف سا اور سفید روئی جیسا؟ سوہنی سی پگ....."

"میرا مختار؟" ماتا جی نے فوراً" ٹوک کر کہا' "ہائے اس بچارے کو کیسے بھول سکتی ہوں؟......"

کمپنی باغ کا نام اب لیاقت پارک ہو گیا ہے۔ اس سے اپنے ٹیکسی ڈرائیور یار کی ایک بات یاد آئی۔ صدر بازار میں سے گزر رہے تھے۔ میں نے پوچھا' "خورشید ہماری طرف تو رشوت' سفارش خوب چلتی ہے۔ یہاں کیا حال ہے؟"

"لیاقت کو تو گولی مار دی ہے نا جی"" اس نے فوراً" جواب دیا۔

"کیا؟ میں تیری بات نہیں سمجھا۔"

"او جی' لیاقت علی خان کو تو گولی مار دی ہے نا۔ باقی تو رشوت علی اور سفارش علی ہی رہ گئے نا۔"

راولپنڈی ۔۔۔ گارڈن کالج میں طالب علموں کے درمیان

شہر کے صحافیوں نے مجھے لیاقت پارک میں پارٹی دی ہے۔ شورش ملک' افضل پرویز (جن کی پنجابی نظمیں بھارتی رسائل میں بھی شائع ہوتی ہیں) اور دیگر کئی دوستوں نے پنجابی اور اردو کی ناقابل فراموش نظمیں سنائیں۔ پھر میری درخواست پر اسی رات ان دوستوں نے پارک میں دور دیہات سے فنکاروں کو بلا کر لوک گیتوں اور رقصوں کا میلہ بھی لگایا۔ زندگی میں پہلی' اور کسے معلوم شاید آخری مرتبہ' میں نے اپنی پیدائشی دھرتی کی گود میں بیٹھ کر دیکھا۔ کئی اور دوستوں کے اہل خانہ بھی' جو میرے ساتھ اب یوں سلوک کرنے لگے تھے جیسے نہ میں کبھی ملک سے باہر گیا تھا اور نہ کبھی جانا ہے' اس "پاگل پن" میں ساتھ دے رہے تھے۔ گنوار ناچوں اور گیتوں پر میرا اس قدر فریفتہ ہونا ان کو غیر فطری سا لگ رہا تھا۔

ناچنے والوں کی پگیں اور انگرکھے ایک دم مارواڑی یا کاٹھیاواڑی انداز کے تھے۔ ان کا ڈنڈیاں بجا کر ناچنا بھی کاٹھیاواری "ڈانڈیا راس" جیسا تھا' لیکن جس مردانگی کے ساتھ یہ پوٹھوہاری گبھرو اچھلتے اور بڑھکیں مارتے تھے' وہ پنجاب کے علاوہ کسی صوبے کے بس کی بات نہیں۔

نرتکوں (رقاصوں) نے مجھے بتایا کہ نرت (رقص) ان کے گھرانوں میں پشت در پشت چلا آ رہا ہے۔ پوشاکوں کے ڈیزائن بھی صدیوں پرانے ہیں' انہیں کبھی نہیں بدلا جاتا۔ نہ ہی نرت کے علاوہ کسی اور موقعے پر استعمال کیا جاتا ہے۔

جھنگ کے رقص دیکھ کر مجھے پنجاب اور کچھ۔۔۔ کاٹھیاواڑ کی تہذیبی مشابہت کا اندازہ ہوا تھا۔ اس کا پکا ثبوت پنڈی میں مل گیا۔ یہ نرت لازماً" عوام کے قبول اسلام سے پہلے کے زمانوں کے ہیں۔ پوٹھوہار کے ماہیے اور ڈھولے اپنی بے مثال خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں۔ ان لوگوں کی ہیر گانے کی بھی اپنی انوکھی طرز ہے۔ اس میں افسردگی اور الم نہیں' بلکہ ڈرامائی نغمگی کی قوت ہے۔

راولپنڈی کے دارالحکومت بننے سے ان فنکاروں کی خود بخود مدد ہو گئی ہے۔ غیر ممالک سے آنے والے معزز مہمانوں کو دیسی لوک فن کے نمونے دکھانے کی خاطر حکومت کی جانب سے انہیں یاد کیا جانے لگا ہے۔ یوں انہیں کبھی کبھی اچھی دولت اور داد و تحسین مل جاتی ہے' لیکن پڑھے لکھے لڑکے لڑکیوں کو' ہمارے ملک کی طرح' لوک ناچ سیکھنے کا شوق ابھی نہیں ہوا..........

سید پور (جس کا دوسرا نام رام کنڈ تھا) اور نور پور (جہاں بری امام کا میلہ لگتا ہے) کی سیر کرتے ہوئے وہ مقام دیکھا جہاں نیا دارالحکومت بنے گا۔ سید پور سے تقریباً" تین میل

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ادھر تخت پڑی کی پہاڑی کو مرکز بنا کر شہر حسن ترائی میں پھیلتا چلا جائے گا۔ مری روڈ پر راولاں نامی مقام پر ایک نیا اور بہت بڑا بند بنایا گیا ہے (راول ڈیم)۔ نیلا پانی جھیل کی صورت میں کئی میل کے رقبہ میں پھیل گیا ہے۔ دارالحکومت کا مشرقی حصہ اس جھیل کو چھوئے گا۔ لگتا ہے اس مقام کو منتخب کرنے والوں کی سوچ چنڈی گڑھ سے بہت متاثر ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کوہ مری کی پہاڑیوں کا نظارہ شوالک کی پربت مالا (سلسلہ کوہ) سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ چنڈی گڑھ کسی فرانسیسی عمارت کار کی سوچ کا کرشمہ تھا۔ پاکستان کے نئے دارالحکومت کو معرض وجود میں لانے کے لئے ایک یونانی عمارت کار کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ دیکھتے ہیں اس شاہانہ دوڑ میں کون جیتتا ہے۔ میرے ہونے تک ابھی کوئی عمارت نہیں بنی تھی۔ تخت پڑی پر کچھ سرکاری عمارات کی بنیادوں کی کھدائی دور سے نظر آ رہی تھی۔

چنڈی گڑھ کی تعمیر کے وقت جب کسانوں کو اپنی زمینوں سے بے دخل کر کے دیگر مقامات پر بھیجا گیا تو وہ بہت دکھی ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بوڑھی عورت میرے ایک دوست کے بنگلے کے پھاٹک پر ہر صبح سویرے بیٹھ کر بین کیا کرتی تھی۔ اجڑتے ہوئے گاؤں کے ایک باسی نے آہیں بھرتے ہوئے کہا تھا "وہاں سے اجڑ کر آئے ہوؤں نے ادھر آ کر ہمیں اجاڑ دیا۔"

میں نے خورشید سے پوچھا "جن کی زمینیں لی گئی ہیں' وہ دکھی تو نہیں۔"

"راجوں کی زمینیں ہیں ناجی"" اس نے جواب دیا (کوہ مری میں آباد قوم کا نام راجے ہے) "جو کل تک گھاس کاٹتے تھے' آج ٹانگیں آسمان کی جانب کئے بیٹھے ہیں۔ یوں پیٹ نکالے ہیں جیسے موچی کے سامنے تراڑ پڑی ہوتی ہے۔ پیسہ پاس ہو تو بندہ مجبور ہو جاتا ہے ناجی..."

☆☆☆

اپنی نوٹ بک سے اقتباس:

اس بوڑھے ماسٹر کی بیوی یاد آ رہی ہے۔ گلیوں کے چکر لگاتے ہوئے کسی نے مجھے بتایا کہ یہاں کوئی ہندو ماسٹر رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کون سے سکول میں پڑھاتے ہیں۔ پتہ چلا کہ کوہ مری گورنمنٹ سکول...... نام بھی بتایا' لیکن یاد نہیں رہا۔ پہلے تو غور نہ کیا' لیکن چار قدم آگے چل کر پھر رک گیا۔ یاد آیا کہ ایک مرتبہ جب کوہ مری چھٹیوں پر گیا ہوا تھا تو وہاں کے ایک لڑکے سے میری دوستی ہو گئی اور ایک روز وہ مجھے بازار سے نیچے اپنے

اپنے بچپن کے ہندو سکول ماسٹر سے ملاقات

گورنمنٹ سکول میں جھوٹی موٹی "داخل" کرانے لے گیا تھا۔ میں سارا دن اس کی جماعت میں بیٹھ کر پڑھتا رہا۔ سوچا کہ مل لینا چاہئے اور شاید اس کے ماسٹر کو پہچان ہی لوں۔

ایک عورت چھجے سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے۔ آگے ماسٹر کو دیکھا' یم راج (جزا و سزا کا حاکم دیوتا) کا مہمان بن کر بیٹھے تھے کرسی پر۔ لقوے کی وجہ سے ہاتھ اور سر دونوں پر رعشہ طاری تھا۔ مجھے فوراً یاد آ گیا' اس روز ان سے حساب (ریاضی) پڑھا تھا۔ یہ ماسٹر پکے آریہ سماجی تھے' اور میرے دوست کے گھر بھی پڑھانے آتے تھے۔ کتنے سوہنے جوان تھے۔ اب بھی اتنے بوڑھے تو نہیں ہوئے۔ اس حالت کو کیسے پہنچ گئے؟ آنکھوں سے نظر نہیں آتا' بول نہیں سکتے۔ سر اور داڑھی کے بال سفید۔ عورت کے حساب کے مطابق ان کی عمر پینسٹھ ستر سے زیادہ نہیں ہو گی۔ یہ حالت ضرور دل کے غم نے کی ہو گی' جو شہر ہندوؤں سے خالی ہو جانے سے دل کو لگ گیا۔ پہلے موت کا خوف تھا' بعد میں بیٹا مسلمان ہو گیا۔ اپنی پسند کی دنیا ختم ہو گئی۔

لیکن ان کی بیوی' وہ عورت' کافی مضبوط ہڈ پیر کی لگتی ہے۔ ہمارے ساتھ خود ہی باتیں کرنے لگی' ماسٹر صاحب تو بول نہیں سکتے تھے۔

"اب اٹھ کر بیٹھنے کے قابل تو ہو گئے ہیں۔ بڑی خدمت کی ہے ودیا ساگر نے۔ بس یہی ایک بیٹا فرمانبردار ہے' رب اسے زندگی دے۔ سب اسی کا حکم ہے بچے۔ ماں باپ

ہندو اور بیٹا مسلمان۔۔ ایک ہی بات نہیں۔ سب ایک ہی ہیں۔ ہماری چتا جلے گی اور ان کی اولاد انہیں قبروں میں دفن کیا کرے گی۔ میں نے تو ابھی تک گنگا کے درشن بھی نہیں کیے۔ ہمارے لئے تو الگ برتن رکھے ہوئے ہیں' یہ تو بیٹے کے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پیتے۔" (ایک برقعے والی لڑکی باہر سے آواز دیتی ہے' "ماتا جی ساگر کدھر ہے؟ ابھی تک نہیں آیا؟") "یہ ساگرے کی دلہن ہے۔ یہ بھی پڑھاتی ہے۔ برقعہ تو اب کوئی نہیں پہنتا' یہ تو کبھی کبھی.... مس کامٹے یہاں ایک ہندو عورت ہے۔ وہ بھی پڑھاتی ہے۔ ہزار روپے تنخواہ لیتی ہے۔ دل مضبوط رکھنا چاہیے۔ کوہ مری میں وہ کہیں قریب ہی رہتے ہیں۔ کتنی کتنی دیر اکیلی ہی بیٹھی رہتی ہوں۔ ڈرنا نہیں چاہیے۔"

پوٹھوہاری دلیری' پوٹھوہاری ہنسی اور پوٹھوہاری ہلکا پھلکا بدن اس عورت کو بڑھاپے میں بھی جوان بنا کر دکھا رہا تھا۔ جس خوف سے اس کا بیٹا مسلمان ہو گیا تھا وہ اس عورت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا۔ بوڑھا ماسٹر رک رک کر بولا۔ دو چار باتیں میں نے بھی کیں' لیکن بیٹھنا متواتر مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

لاہور' سرگودھا' جھنگ وغیرہ شہروں میں پنڈی برانڈ تانگے چلتے دیکھ کر مجھے بہت غرور ہوا تھا' لیکن خود اپنے شہر میں ان کی حالت قابل رحم دیکھی۔ دارالحکومت بننے کے بعد...... چھوٹی ٹیکسیوں نے آ کر ان کا کاروبار ختم کر دیا ہے......

اسلم ملک بی۔ بی۔ سی لندن میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ اب پاکستان کے ڈپٹی چیف آف پروٹوکول لگے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر ٹیکسلا دکھا لائے۔ بیس سال بعد آج پھر عجائب گھر دیکھا' جس میں گپت اور موریہ عہد کی تہذیب کے انمول خزانے رکھے ہوئے ہیں۔ بے شمار چھوٹے بڑے بت پڑے ہیں یہاں۔ ہر بت کی اپنی جدا شکل و شباہت ہے۔ جیسے آج کل فوٹو کھنچوانے کا رواج ہے اسی طرح اس وقت بت بنانے کا رواج ہوتا ہو گا۔ عہد قدیم کی بھارتی تہذیب کے اس قدر مکمل طور پر درشن کرانے والا عجائب گھر ٹیکسلا کے علاوہ اور کوئی نہیں' یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے۔ پاکستانی حکومت نے اسے کمال سگھڑپن کے ساتھ سجا کر رکھا ہوا ہے۔ اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ دکھانے والے گائیڈ یونانی اثرات کا ذکر ایسے انداز میں کرتے ہیں جیسے بدھ دور کے بھارت نے ساری تہذیب یونانیوں سے ہی سیکھی ہو......

ٹیکسلا سے واپس آ کر رات کو اسلم ملک اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ فلیش مین

ہوٹل میں ڈنر کھایا۔ جب باہر نکلے تو ایک نوجوان نے قریب آ کر کہا' "بلراج جی! میں میاں افتخار الدین مرحوم کا لڑکا ہوں۔ ممی بہت افسوس کرتی ہیں کہ آپ لاہور انہیں ملنے تک نہیں گئے......." میں لاجواب ہو کر اس کی جانب دیکھتا رہ گیا.....

پورا ایک دن کوہ مری کی سیر کی۔ خورشید جان گیا تھا کہ سب سے زیادہ پنجابی زبان کی کشش ہی مجھے پاکستان کھینچ لائی ہے' اور وہ بولی کا ماہر تھا' مزاح کا شہنشاہ' سارا دن مجھے ہنساتا رہا۔ ایک دفعہ پہلے بھی کوہ مری میں ایسے ہنسا تھا۔ تب دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ لڑکوں کی ایک ٹولی سکول سے بھاگ کر کوہ مری روانہ ہو گئی۔ اس ٹولی کا سردار تھا موہن۔ اس نے سارا دن ہنسا ہنسا کر ہم سب کو مار ڈالا۔ اس خورشید کی طرح ہی دبلا پتلا تھا وہ بھی۔ چھوٹی سی بات پکڑ لیتا اور پھر اس کی کھال اتار اتار کر سننے والوں کو نہال کرتا جاتا۔ اب کون جانے کہ موہن کہاں اور کس حال میں ہو گا؟ خورشید کی بھی یہی ٹیکنیک تھی۔ کیسے سٹوڈیو میں اس نے شوٹنگ دیکھی۔ کیسے اس کا ایک دوست فلمی اداکار بننے کے لئے گھر سے بھاگ کر کراچی چلا گیا' اور "بھوک کے شوق" پورے کر کر کے گھر واپس آ گیا۔ کبھی وہ یو۔ پی کے علاقے سے آئے مہاجروں کا ذکر لے بیٹھتا۔ ان کی "مل فریب" والی مونچھوں کا مذاق اڑاتا۔ شاید وہ لوگ مردے کو اتنا گہرا دفن نہیں کرتے جتنا کہ پنجابی کرتے ہیں۔ اس بات پر اس نے "پنجاں پانڈ واں" کے پاس سے گزرتے ہوئے تبصرہ شروع کیا اور بمشکل پوسٹ آفس پہنچ کر ختم کیا.......

پھر واپس' ایوب پارک۔ سکیورٹی آفس میں پاسپورٹ پر رخصتی کی مہر لگوائی ہے۔ رخصتی کی یا جلاوطنی کی؟ ایوب پارک میں ایک بڑا سا اوپن ایئر تھیٹر بنا لیا ہے۔ اس کی سیڑھیوں پر کھڑے ہیں۔۔۔ خورشید اور میں۔ ایک دوسرے سے دور' جیسے آپس میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہو۔ اس کے آنسو بہتے ہیں نہ میرے۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

تھوڑی دور جھاڑیوں میں "چھپ" کر سی۔ آئی۔ ڈی کے موٹر سائیکل سوار۔۔۔ جنہوں نے پورے پانچ دن مسلسل ساتھ نبھایا۔۔۔ ہمارے اوپن ایئر ڈرامے کے آخری سین کا خوب لطف اٹھا رہے ہیں۔ چک لالہ کا ہوائی اڈہ یہاں سے بس دس منٹ کا پیدل سفر ہے......

14

پوٹھوہار کی دھرتی ہوائی جہاز سے بہ نظر طائر دیکھنا ایک فیاضی تھی جس نے وطن سے بچھڑے ہوئے کے دکھ کو کچھ حد تک ہلکا کر دیا۔ اگر میں شاعر ہوتا تو اس تجربے کو الفاظ کا بھیس پہنا سکتا۔ جب ہوائی جہاز چلتے وقت پچھلی سیٹ سے آواز آئی تھی "پیٹی لائی کھنو!" (پیٹی باندھ لیں) تو جذبات بے قابو ہو گئے اور کچھ شعر جوڑے' لیکن کاغذ پر آنے کے قابل نہ ہو سکے۔ پھوٹھوہار کا پہاڑی سلسلہ عین دریائے جہلم کے کنارے تک جا پہنچتا ہے۔ اگر شاعری ضرور کرنی ہو تو اس "سطح مرتفع" کو ایک چوڑے اور اونچے سے پلنگ کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ پیچھے کوہ مری اور کشمیر کے پہاڑ اس قیمتی پلنگ کا اونچا ڈھوہ ہیں۔ پائلٹ نے لاؤڈ سپیکر میں اعلان کیا کہ نیچے پہاڑیوں میں منگلا ڈیم دکھائی دے رہا ہے۔ ساعت بھر پہلے اخبار میں پڑھا تھا کہ کئی دنوں سے اس ڈیم کے مزدوروں کی ہڑتال جاری ہے۔ مزدور تنظیم کمزور ہونے کی وجہ سے انہیں رہائش اور خوراک کی کم از کم سہولیات بھی نہیں مل رہی تھیں۔ اخبار کے مطابق' مزدوروں نے انتہائی لاچار ہو کر ہڑتال کی۔

اخبار میں یہ خبر بھی پڑھی تھی کہ لداخ اور نیفا کی حدود پر چین نے ہند کی نو چوکیاں مزید اپنے قبضہ میں کر لی ہیں۔ صدر نے ہنگامی صورتحال کا اعلان کر دیا ہے۔

ائیر ہوسٹس نے مجھے پہچان لیا' آٹوگراف لیا اور درخواست کی کہ بمبئی پہنچ کر بے بی ندا کا دستخط شدہ فوٹو اسے ضرور بھیجوں۔ پروازوں کے دوران ہندوستان کے شہروں کی سیر کا اسے موقع مل جاتا اور ہندی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتی ہے.....

فیشن کے لئے مشہور شہر لاہور کا ہوائی اڈہ بھی اس کی شان کو چار چاند لگاتا ہے۔ کوئی عالیشان عمارت تعمیر نہیں کی گئی۔ دور سے دیکھنے پر کسی فیکٹری کا لمبا چوڑا شیڈ معلوم ہوتا ہے' لیکن اندر کی خوب صورتی اور قرینے کو دیکھ کر انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ بہت سا

حصہ ائیر کنڈیشنڈ ہے۔ ہر جانب دیدہ زیب اور ہلکا پھلکا فرنیچر' گلدستے اور سامان آرائش۔ ایسا ماحول یورپ کے ہوائی اڈوں میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے' جہاں امارت دکھلاوے کی نہیں' سگھڑ اور راحت رساں ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ پہلے قیام کے دوران ڈاکٹر نذیر احمد ایک شام مجھے یہاں لائے تھے۔ چست وردیوں والے ہوا بازوں اور کارندوں نے بڑی محبت سے ریستوران میں کافی پلائی تھی۔ وہ مجھے ہو بہو اپنے ملک کے ہوا بازوں جیسے لگے تھے' فرق محض اتنا تھا کہ انگریزی کی بجائے بڑی شستہ اردو بول رہے تھے' لیکن جو ان کی ماں بولی نہ ہونے کی وجہ سے سننے میں اجنبی لگتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے فارسی کے بہت بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے' جیسے حیدر آبادی لوگ کرتے ہیں۔ میرا پنجابی بولنے کو بہت دل چاہا لیکن ہمت نہ ہوئی۔ یہ نوجوان بالکل ہمارے اپنے پڑھے لکھے نوجوانوں جیسے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ کہ یہی عزت افزائی مجھے لاہور میں پہلی مرتبہ غیر ملکی اور اجنبی ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ لیکن بہت تعجب خیز سے احساس تھا یہ' اور میں کافی دیر تک دل میں اس کا سبب ڈھونڈتا رہا۔

ہوائی جہاز سے اتر کر جب مسافروں کے لاؤنج میں آیا تو بنگالیوں کی بڑی تعداد دیکھی۔ یقیناً یہ مشرقی بنگال کے ہی لوگ تھے۔ لیکن میری نظر انہیں صرف بنگالیوں کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ مجھے بنگالیوں سے بہت پیار ہے۔ بہت دل چاہا کہ بنگالی میں ان کے ساتھ دو چار باتیں کروں۔ لاہور میں اتنے زیادہ بنگالی!

پاسپورٹ وغیرہ کی رکاوٹیں دور کرنے کے لئے ڈاکٹر نذیر کا پرائیویٹ سیکرٹری پھر حاضر ہو گیا تھا۔ پھر وہی کشادہ بنگلہ۔ ایک اعلیٰ درجے کی گھریلو زندگی کی مٹھاس۔ لاہور کی اپنی مخصوص آزاد سی فضا۔ کہتے ہیں کہ لاہور لاہور ہی ہے (لہور لہور اے)۔ میرا احساس آج بھی اس کی تصدیق کر رہا تھا۔ اس کا راز اوسط درجہ کی سماجی زندگی پر یورپی ثقافت کے اثر سے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ انگریز دور میں اس اثر کے تاریک پہلو کافی نمایاں تھے۔ آزادی دور میں اسے مجموعی عوامی زندگی کی اصلاح کے لئے' اسے کافی حد تک باقاعدہ اور منظم بنانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے' لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب خود کو اوسط درجے کے عوام میں مدغم کرے۔ اس کام میں لکھاری اور فن کار بہت کردار ادا کر سکتے ہیں' بشرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں عوامی لکھاری اور فن کار بننے کی قابلیت اپنے اندر پیدا کریں۔ کسی کے منہ سے سنا تھا' پتہ نہیں جھنگ میں یا کہیں اور کہ وارث شاہ کی ہیر پاکستانی پنجاب میں اب بھی ہر سال تقریباً" ایک لاکھ کی تعداد میں فروخت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں فیض احمد فیض کی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

شاعری کتنی فروخت ہوتی ہو گی؟ کیا اس کا اثر پڑھے لکھے متوسط طبقے تک ہی محدود نہیں رہ جاتا؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فیض کی شاعری میں کوئی خامی ہے' بلاشبہ وہ دنیا کے عظیم شاعروں میں سے ایک ہے۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر مان کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے بنچوں پر میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی کلاس میں پڑھا تھا؟ لیکن سوچتا ہوں کہ اگر وہ پنجابی میں شاعری کرتا تو کتنا اچھا ہوتا؟ لیکن اس کے ملک کو تو اس کی اردو کی اور متوسط طبقے تک اثر کرنے والی شاعری بھی برداشت نہ ہوئی۔ اسی الزام میں تو وہ آج جلاوطنی کی خاک چھان رہا ہے۔ اگر اسی انقلابی رنگ میں اسی ہنر مندانہ انداز میں وہ پنجابی میں شعر لکھتا تو شاید اسے اس سے بھی زیادہ مشکل سزائیں ملتیں!......

بلراج ساہنی ۔عبداللہ ملک ۔ احمد راہی

ڈرائنگ روم میں بیٹھا اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا کہ پنجابی کے مشہور شاعر احمد راہی آ گئے۔ ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی' لیکن کبھی کبھی ان کی تخلیقات اپنے پنجابی رسائل میں پڑھی تھیں۔ پنڈی چھوڑ آنے کا تازہ تازہ دکھ شاید انہوں نے میری آنکھوں میں پڑھ لیا اور انہیں بھی اپنا بچھڑا ہوا شہر امرتسر یاد آ گیا۔ جس کا جوگی پھیرا لگاتے ہوئے کچھ برس پہلے انہوں نے ایک نظم لکھی تھی :

"دیس والیو اپنے دیس اندر
اسیں آئے ہاں وانگ پر د۔یساں دے

گھراں والیو اپنے گھر اندر
اسیں آئے ہاں وانگ پروہنیاں دے۔"

وہ مجھے یہ نظم سنانے لگے۔ جوں جوں سنتا گیا مجھے اپنا دکھ ان کے دکھ کے مقابلہ میں چھوٹا نظر آنے لگا۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ وطن کل تیس میل کے فاصلے پر ہو اور انسان اس کے نزدیک نہ جا سکے۔ جب انہوں نے کہا :

"ایس مٹی دی کوکھ وچ ماں میری
ستی پئی ہے سیاں دی ہوک بن کے
ایس پانی نال پانی ہوئے نیر میرے
ایتھے آس ترٹنی میری کوک بن کے......
کسے نبھ دے اکلڑے رکھ وانگوں
دھپاں چھاواں دے بھار نال ڈولنا واں
اپنی ماں دی قبر نوں لبھدا واں
بھیناں بھراواں دیاں ہڈیاں ٹولنا واں۔"

میں راہی کے کرب کی وجہ سے بہت بے حال ہوا۔ مجھے شرم آنے لگی کہ سارے کا سارا امرتسر اس کے حوالے کر دینے کی توفیق مجھے کیوں نہیں؟ لیکن جب وہ آخری بند پر پہنچا تو خیال اپنے دکھ کی طرف بھی لوٹ آیا۔ میں صوفے پہ گر کر رونے لگا۔ معلوم نہیں تھا کہ کون سے آنسو راہی کے لئے ہیں اور کون سے اپنے لئے :

"تسیں دیس والے' تسیں گھر والے
اسیں بے گھرے' اسیں پردیسی
تسیں ہس کے بیٹے نال لاتا
اساں رو کے اکھ پرچالتی
تارے بجھے ہوئے فیر اک وار چمکے
جہدی آس نہیں تھی اوہ آس ہکی
جیوے شہر میرا' جیون شہر والے
اسیں آئے دعاواں ایہہ دے چلے
چارے کنیاں ساڈیاں ویکھ خالی
اسیں نال ناہیں کجھ لے چلے۔"

(تم اہل وطن تم گھر والے، ہم بے گھر ہم پردیسی۔ تم نے خندہ پیشانی سے گلے لگا لیا اور ہم نے رو کر آنکھ کو بہلا لیا۔ بجھ چکے تارے ایک مرتبہ پھر چمکے، جس کی امید نہیں تھی وہ امید پوری ہوئی۔ میرا شہر اور شہر والے جیتے رہیں، ہم آئے اور یہ دعائیں دے کر جا رہے ہیں۔ ہماری چادر کے چاروں خالی کونے دیکھ لو، ہم ساتھ کچھ بھی نہیں لے کر جا رہے۔ مترجم)

ایک مرتبہ میرے استاد پطرس نے لاہور کا جغرافیہ لکھا تھا۔ آج ان کا یہ ناچیز شاگرد لکھ رہا ہے۔ انار کلی۔۔۔۔ بھیڑ اتنی ہی ہے، لیکن رونق اتنی نہیں۔ پنڈی کی طرح یہاں بھی پہلے جہاں ہندو کپڑا بیچتا تھا اب وہاں مسلمان بیچ رہا ہے۔ جس دکان پر خیاری والا بیٹھتا تھا وہاں اب بھی خیاری والا بیٹھتا ہے۔ جہاں ہندو دودھ لسی بیچتا تھا اب مسلمان بیچتا ہے۔ سکھوں کی کمی مولوی ٹائپ مسلمانوں کی داڑھیاں کسی حد تک پوری کرتی ہیں، لیکن عورتوں کی غیر حاضری کوئی چھلاوا پوری نہیں کر سکتا۔ ان کی سہولت کے لئے انار کلی کے اندر تنگ گلیوں میں "بانو بازار" بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی ترقی پسند تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی۔

گلی محلوں میں سے گزر کر، جو اب بھی ہمیشہ جیسے ہیں..... (البتہ ٹبی بازار میں کشمیری حسن کی کمی سنا ہے شوقینوں کو ضرور مایوس کرتی ہے)..... شاہی مسجد کی لازوال خوبصورتی کا لطف اٹھایا۔ صدر دروازے کے سامنے ایک جانب عظیم شاعر اقبال کا اور دوسری جانب سر سکندر حیات کا مقبرہ ہے۔ بڑی خوبصورت اور دیدہ زیب عمارتیں ہیں، لیکن زیارت کرتے وقت یہ نہ بھول سکا کہ سر سکندر حیات تقسیم سے کئی سال پہلے اس کے

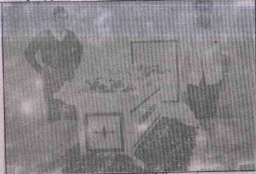

بلراج ساہنی ڈاکٹر محمد اقبال کے مزار پر حاضری دے رہے ہیں۔

بھیانک نتائج اور قتل عام کی پیش گوئی کر چکے تھے، جس پر گاندھی جی کے علاوہ کسی اور ملکی رہنما نے غور نہ کیا۔ اقبال کے مزار پر پہنچ کر بار بار دل میں سوال اٹھتا تھا کہ مندرجہ ذیل اشعار لکھنے والے کی روح یہاں پوری طرح مطمئن ہے؟

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس زمیں میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
دنیا کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے......

گورو ارجن دیو کی سمادھ بھی یہاں سے نزدیک ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی حفاظت نہیں ہوتی۔ باہر بندوق کندھے پر رکھے ایک سپاہی ضرور کھڑا ہے، لیکن حالت وہی ہے جیسے ایک تاریخی کھنڈر کی۔ اندر جانے کے لئے جوتے اتارنے پڑتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد ہی جرابیں ایک عرصہ سے صاف نہ کئے گئے فرش کی دھول میں لت پت ہو جاتی ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا اتنا نہیں جتنا یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ میرے مسلمان ساتھیوں میں سے کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ یادگار ان کی ماں بولی کے خالق اور مشترکہ پنجابی قومیت کے بانی، ایک مہان فلسفی اور فن کار کی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ امرتسر کے گورو مندر کی بنیاد اس عظیم شخص نے ان کے اپنے ہم مذہب پیر میاں میر کے ہاتھ سے رکھوائی تھی۔ لیکن کیا اس بے قدری اور بے قربت کے ذمہ دار محض مسلمان لوگ ہیں؟ کیا اتنی ہی ذمہ داری سکھوں پر لاگو نہیں ہوتی؟ اسی گورو ارجن نے گورو گرنتھ میں شیخ فرید کی بانی سجائی تھی جس کے سامنے سکھ ہر روز گوردواروں میں جا کر ماتھا ٹیکتے ہیں۔ سکھوں کے ہی دسویں گورو نے بھگوان کو اللہ، رحیم اور کریم کے نام سے یاد کیا تھا۔ پھر انہوں نے کون سی مذہبی تربیت کی بنیاد پر اپنی مقدس کرپانیں بے گناہ مسلمان عورتوں اور بچوں کے خون میں تر کیں؟ کیا کوئی سکھ رہنما اس سوال کا جواب دے سکتا ہے؟

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پرانا قلعہ دیکھا۔ وہ شیشوں جڑی چھتیں دیکھیں جن کے نیچے ان گنت آزادی کے پروانوں کو ناقابل بیان اذیتیں دی گئیں۔ ان کی قربانی نے صرف بھارت نہیں بلکہ پاکستان کی آزادی کا دن بھی قریب کیا' لیکن یہاں کہیں بھی ان کا ذکر تک نہیں ملتا' کہیں کوئی یادگار نہیں۔ قلعہ صرف ایک سیر گاہ بنا دی گئی ہے۔

معلوم ہوا کہ استاد دامن بھی کہیں نزدیک ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا' کیونکہ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔

لاہور کے نئے جغرافیہ میں صنعت نے کوئی خاص حصہ نہیں ڈالا تھا۔ نئی سڑکیں' بستیوں اور رہائش گاہوں نے اسے کافی حد تک مزئین کیا ہے۔ ان میں سب سے مشہور اور قابل دید علاقہ "گلبرگ" کہلاتا ہے۔ قائد اعظم پارک (لارنس گارڈن) کی جانب سے نہر پار کرتی اور خوبصورت گھنے درختوں کے حاشیئے والی سڑک اس کی طرف جاتی ہے۔ امیروں نے نہایت خوبصورت بنگلے یہاں بنائے ہیں۔ درآمد کی آزادی کے باعث بہت خوبصورت موٹریں ادھر لوھر دوڑتی پھرتی ہیں۔ کالج کے ایک پرانے دوست کے گھر دعوت ہوئی۔ لان میں بیٹھ کر کئی گھنٹے بیئر پی گئی۔ لاتعداد یادیں اور دوستیاں دوبارہ تازہ ہو گئیں۔ فراغت' فرصت' جذباتی اور ذہنی سکون' گرم اور گہری دوستیوں کی بدولت ہمیشہ کی طرح لاہور لاہور ہی ہے۔ اس اعتبار سے شاید کوئی اور شہر اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس دوران کبھی کبھی بمبئی کی مشینی زندگی کی طرف دھیان چلا جاتا' روح کانپ اٹھتی۔ ڈرامہ' فلم' موسیقی' ادب وغیرہ کے متعلق خوب باتیں ہوئیں۔ بیچ بیچ میں لطیفوں اور چٹکلوں کا سلسلہ بھی چلا۔ یوں لگا جیسے عمر بیس سال کم ہو گئی ہے۔ لیکن میں خود سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ بیس سال چھوٹا ہو جانا مجھے واقعی پسند ہے؟ فوراً" یوں لگنے لگا جیسے میں چھوٹا نہیں ہوا' بیس سال سے میرے ان دوستوں کی ترکی رکی ہوئی ہے۔ ان کے نظریات میں اب بھی نقادوں والا دانشورانہ گھمنڈ ہے' تخلیق کاروں والی روشن خیالی اور نرم دلی نہیں آئی۔ لطیفے اور چٹکلے بھی پرانے تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے وقت لاہور کو پیچھے چھوڑ کر بہت دور آگے گزر گیا ہے۔

یہاں سے مال روڈ پر "آرٹ کونسل" کے ممبران کے ساتھ چائے پینے جانا تھا۔ آدھ گھنٹہ تاخیر سے پہنچا' اس قصور کے لئے شاید میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔

سید امتیاز علی تاج' جن کے پیالے میں سے میں نے فن اداکاری کے شوق کا پہلا گھونٹ بھرا تھا' شوکت صاحب اور دیگر کتنی ہی قابل احترام ہستیاں خاموشی سے میری منتظر تھیں۔ قصداً" دیر نہیں کی تھی' لیکن مجھ سے غفلت ضرور ہوئی۔ فلم ایکٹروں کی شہرت اس

لحاظ سے ویسے بھی اچھی نہیں۔ پتہ نہیں کیا سوچتے ہوں گے؟ لیکن ان کی محبت نے میری شرمندگی کو دوگنا کر دیا۔ کسی نے پیشانی پر شکن نہ آنے دی۔ مجھے اپنے اندر یوں سمو لیا جیسے دودھ میں چینی گھل جاتی ہے۔ بڑی خوبصورت شام تھی وہ۔ صدر صاحب سبھاش چندر بوس کے پرانے ساتھی اور میرے کالج کے دوست کرنل احسان قادر کے ساتھ بیٹھ کر "پدما ندیر ماجھی" کے نام کے بنگالی ناول کی بنیاد پر مشرقی پاکستان میں بننے والی ایک اعلیٰ فلم دیکھی' جسے کچھ سال پہلے ماسکو فلمی میلے میں ایوارڈ ملا تھا۔ مایوسی دور ہوئی' کافی حوصلہ ملا۔

15

اگلے دن سید امتیاز علی تاج نے اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی۔ یوں کئی اور پیارے دوستوں کو ملنے کا موقع ملا' جو کسی زمانے میں ہندوستان کے فلمی افق کے جگمگاتے ستارے تھے' نور جہاں' نیینا' رفیع پیر' ڈبلیو زیڈ احمد.......

لاہور کے نئے جغرافیہ میں ملتان روڈ نے اہم حیثیت حاصل کر لی ہے۔ کئی کارخانے وجود میں آگئے اور آ رہے ہیں' لیکن اس کی زیادہ شہرت نئے فلمی سٹوڈیوز کی وجہ سے ہے۔ شوکت صاحب خود اپنا بہت بڑا سٹوڈیو بنا رہے ہیں۔ "ایورنیو" بھی ایک نیا اور بڑے پیمانے کا' اعلیٰ ٹیکنیکل سامان کے ساتھ لیس سٹوڈیو ہے۔ یہاں پاکستان کے ممتاز فلم پروڈیوسروں' ڈائریکٹروں اور فلمی ماحول سے اکثر تنگ آ جاتا ہوں' لیکن باہر جا کر اپنے اس پیشے کے لئے دل میں عزت پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ناچیز سے آدمی کو بھی اس قدر معزز بنا دیتا ہے۔

سیر کے دوران جب بھی وقت ملا میں پاکستانی فلمیں دیکھتا اور ان کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ اب تک اولاد' سسرال' بنجارن' چراغ جلتا رہا' چار اردو فلمیں اور دو بنگالی فلمیں دیکھ چکا تھا۔ پنجابی کی شاہکار فلم "کرتار سنگھ" دیکھنے کو بہت دل کرتا تھا' لیکن اس کی کہیں بھی نمائش نہیں ہو رہی تھی۔ "ایورنیو سٹوڈیو" میں پانچ چھ زیر تکمیل فلموں کی ریلیں بھی دیکھیں۔ اس ملاقاتی سلسلے کے روح رواں تھے پاکستان میں پہلے نمبر پر شمار کئے جانے والے اداکار علاؤ الدین۔ وہی کرتار سنگھ کے ہیرو ہیں اور "سسرال----" جس میں ان کا کام اپنی آنکھوں سے دیکھا---- "دو بیگھہ زمین" "جاگتے رہو" اور "پاتھیر پنچالی" جیسی اعلیٰ درجے کی فلموں کی برابری کرتی تھی۔

اس فلم کی ساری شوٹنگ لاہور کے گلی محلوں میں ہوئی۔ کم و بیش ہی کوئی سین سٹوڈیو میں شوٹ کیا گیا۔ اس وجہ سے فلم میں ایسی خوبصورتی پیدا ہوئی جو دیکھنے سے تعلق

رکھتی ہے۔ پریمی کاغذی پھلواریوں میں ناچتے گاتے نہیں دکھائے جاتے' بلکہ تاریک سیڑھیوں اور ٹوٹی چھتوں کی اوٹ میں چوری چوری ملتے ہیں' جیسے کہ زندگی میں حقیقتاً ہوتا ہے۔ مرکزی کردار ایک بینڈ کا ترمچی ہے۔ روزانہ باراتیں روانہ ہوتی ہیں جن میں یہ آگے آگے ترم بجاتا چلتا ہے' لیکن غریب ہونے کی وجہ سے اس کی اپنی شادی نہیں ہوتی۔ محلے میں ایک عیار آدمی نے رشتہ کرانے کی ایجنسی کھولی ہوئی ہے۔ ترمچی سے خاصی رقم بٹورنے کے باوجود وہ اسے ایک بے رحم دھوکے کا شکار بناتا ہے' خوبصورت لڑکی دکھا کر بدصورت سے اس کا نکاح پڑھا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح محلے کے دیگر کردار بھی ایک دوسرے کے ساتھ دھوکہ کرتے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ دل کے برے نہیں' اور نہ ہی اپنی مرضی سے ایسا کرتے ہیں۔ وہ سماجی حالات سے مجبور ہیں اور یہی علم انہیں ہنس کھیل کر وقت گزارنے کی قوت بخشتا ہے۔

علاؤ الدین نے کمال کی ہنرمندی کے ساتھ یہ کردار ادا کیا ہے' لیکن اس فلم کے پروڈیوسر ڈائریکٹر ریاض شاہد ہیں۔ سچی بات تڑاک سے کہہ دینا اس نوجوان کا نظریہ حیات معلوم ہوتا ہے' اور یہی خطرناک خصوصیت اس کی آنکھوں' اس کے چہرے اور فن میں تمتماہٹ اور تڑپ پیدا کئے رکھتی ہے۔ زندگی کی سچائی سے اسے عشق ہے۔ اس کو وہ بناوٹی خوبصورتی کا بہروپ اوڑھ کر بدصورتی نہیں بناتا اور یوں وہ نئی راہوں کا متلاشی ہے۔ کئی دوسرے پروڈیوسروں کے مقابلے میں' جو بمبئی سے آئے اور بمبئی کے انداز پر ہی چلتے ہیں' اس سے بہتر اور اعلیٰ فلم کاری کی کافی امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔

سٹوڈیو میں نیلو' درپن' جعفری' اسلم پرویز' لیلہ' صبیحہ اور کئی دوسرے ممتاز فلمی ستاروں کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع میسر آیا۔ جس پیار اور خلوص کے ساتھ یہ لوگ اور سٹوڈیو کے ٹیکنیشن میرے ساتھ پیش آئے' میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔

ریاض شاہد اور علاؤ الدین (جو میرے وطن راولپنڈی کے رہنے والے ہیں) کے مطابق پاکستان میں ہر سال تقریباً چالیس فلمیں بنتی ہیں۔ اس میں سے ساٹھ فیصد ایک دم بھارتی اور امریکی فلموں کی نقل' تیس فیصد روایتی فارمولوں کے مطابق اور صرف دس فیصد خالص تخلیقی اور فنی ہوتی ہیں۔ پاکستانی فلمی صنعت کی موجودہ لڑکھڑاتی ہوئی پوزیشن بھی کے لئے باعث پریشانی ہے۔

میرے اپنے موٹے موٹے اندازے یہ ہیں:

1- پاکستان میں فنکاروں کی کوئی کمی نہیں۔ بالخصوص لڑکیاں تو اپنے جلالی حسن اور ڈیل

ڈول کے ذریعے "چڑھیا ہند تے کنک پنجاب دا" والی بات کو سچا ثابت کرتی ہیں۔

2- پاکستان کے پاس نظریہ معاشرتی زندگی میں پردہ داری کا ہے' لیکن فلموں میں بے پردگی کا زور لگتا ہے۔ نیم برہنہ جسموں کی جنونی اور لذت آمیز ہلچل لوک اور علمی رقص کے سارے قواعد و قوانین پر غالب آ چکی ہے۔ یہ صورتحال باہر سے آئے آدمی کو کافی حیران کرتی ہے۔

3- حکومت کی جانب سے دی گئی خاص سہولیات اور بھارتی فلموں کی درآمد بندی وغیرہ کا پاکستانی فلم انڈسٹری نے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا۔

4- دونوں ممالک کے مابین اعلیٰ درجے کے انسانیت پسندانہ فلموں کا تبادلہ نہ ہونا نہایت افسوسناک بات ہے۔ اگر پاکستان میں "دو بیگھہ زمین" "کابلی والا" جیسی فلمیں نہیں جا سکتیں تو کم از کم ہمارے ملک میں "کرتار سنگھ" اور "سسرال" جیسی فلمیں تو لازما" آنی چاہئیں۔ اگر یہ ڈسٹری بیوٹرز کے لئے فائدہ مند نہیں تو ہماری حکومت کو خود آگے بڑھنا چاہئے۔ صرف تقریریں کرنے اور بیان دینے سے دونوں ممالک کے بندھن سہانے نہیں ہو سکتے۔

گورنمنٹ کالج کے ہال میں' جو میرے لئے تیرتھ ستھان ہے' ڈرامہ سوسائٹی نے مجھے ڈنر کی دعوت دی۔ سید امتیاز علی تاج' امداد حسین اور دیگر کئی پرانے ساتھی میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ لیکن میری نگاہیں بار بار اس خیال پر جا ٹکتی ہیں جہاں احمد شاہ بخاری کے بے خروش قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے' ایرک ڈکنسن گانا بھڑکاتا ہوا گزر جاتا ہے۔ مدن لال کا بدن لہولہان ہو کر تڑپتا ہے۔ ان گنت یادیں دماغ میں کوکتی ہیں۔ سٹیج پھر سج رہا ہے۔ پردہ اٹھ گیا۔ ڈرامہ نگار کی مرحوم بیوی دمو اور ستیش کتنا خوبصورت کردار ادا کر رہے ہیں! کہاں غائب ہو گئے دونوں؟ اتنی چھوٹی عمر میں بھی کوئی مرا کرتا ہے؟ لائٹیں ایک دم آف کیوں ہو گئیں؟ وہ دور' بہت دور روشنی کا ایک نقطہ سا دکھائی دے رہا ہے۔ کیا ہے وہ؟ بڑا ہوتا جا رہا ہے' نیلا نیلا۔ اس کے اندر نیلا سوٹ پہنے کیا میں ہی کھڑا ہوں؟ ہاں' میں ہی ہوں۔ بڑا مزہ آیا تھا کردار کرنے میں۔ اچانک سٹیج پر ایک طلسم سا چھا گیا تھا۔ مجھے اپنے سارے بند کھلتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ ساری رکاوٹیں دور ہوتی لگتی تھیں۔ میں اس نیلی روشنی کے حلقے میں کھڑا کس کا منتظر ہوں؟ ناظرین کے درمیان اندھیرے میں امتیاز صاحب کا چہرہ نظر آیا تھا۔ کیا انہیں میرا کردار پسند آیا؟ آج میں نے امرت (آب حیات) چکھا ہے۔ آج خاص دن ہے؟ وہ آتے کیوں نہیں؟ شاید کسی وقت آئے اور مجھے بانہوں میں

سمیٹ لیا..... یہ کون بول رہا ہے؟ ڈاکٹر نذیر احمد تقریر کر رہے ہیں۔ "جب بمبئی میں بلراج صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہیں میں نے یہاں ٹھہرنے کی دعوت دی' تو مجھے مطلق اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی مشہور ہستی ہیں اور انکی وجہ سے میرے گھر میں اتنی بھیڑ بھاڑ ہو جائے گی۔" اور اب میں جواب دے رہا ہوں "جب بمبئی میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھے بھی یقین نہ آیا کہ ان جیسا فقیر نما آدمی گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل ہو سکتا ہے۔ مجھے شک ہوا تھا کہ کہیں وہ میرے ساتھ چار سو بیسی تو نہیں کر رہے؟"...... تکلف' بے مطلب تکلف!! نئے لڑکے مجھے بڑی بے یقین نظروں سے دیکھ رہے ہیں' جیسے ان کے ساتھ بھی کوئی چار سو بیسی کی جا رہی ہو۔ بھلا کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کالج پہلے کسی اور طرح کا ہوتا تھا؟.....

اے تازہ وار دان بساط ہوائے گل
زنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نوش ہے

خاموش! وہ کیا لگتے ہیں تمہارے؟ تم کیا لگتے ہو ان کے؟ سوچ سمجھ کر بولو۔ صبح ریاض شاہد نے جو رقعہ بھیجا تھا وہ تمہاری سمجھداری اور سیانے پن کا سرٹیفکیٹ ہے:

"بلراج صاحب!

آپ ایک دل آویز مسکراہٹ بن کر سٹوڈیو آئے اور چلے گئے۔۔۔۔ اور یہ مسکراہٹ ہماری آنکھوں کے سامنے اتنا کم عرصہ رہی کہ یہ مسکراہٹ خیر سگالی جذبہ تھی' سیاسی ضرورت تھی' اظہار طنز تھی' یا محض عادت۔ آپ کے چلے جانے کے بعد بھی میں کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔"

بس ایسا ہی کیا کرو۔ ایکٹنگ اسی کو کہتے ہیں۔ آج کے دور میں ایکٹروں کی بہت قدر ہے' کیونکہ ہر آدمی ایکٹر بن چکا ہے۔ یہ جذبات کا نہیں' جذبات کے اظہار کا دور ہے۔

گاڑی چلنے والی ہے۔ وہی ڈبے اور وہی انجن جو پندرہ دن پہلے مجھے ہندوستان سے لائے تھے۔ یہی ہندو ڈرائیور اور اس کا سکھ فائر مین۔ فراق کے انتظار میں اپنے ان دوستوں کی چھوٹی سی بھیڑ میں کھڑا ہوا تھا جن میں سے کئی کو بیس برس بعد دیکھا تھا اور اب پھر پتہ نہیں کب دیکھوں گا؟ احمد راہی بھی تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر گاڑی امرتسر پہنچ جائے گی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جو کبھی اس کا شہر تھا اور اب صرف اس کے خوابوں کا۔ عبداللہ ملک' کتنی سیر کرتا تھا بمبئی' کلکتہ کی۔ اب دہلی تک جانے کے لئے سو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ انگلستان میں جیسے لوگ متواتر موسم کا ذکر کرتے ہیں' ویسے ہی پاکستان میں "ویزہ" کا عام ذکر ہوتا ہے۔

ہم سب بھونچکے سے کھڑے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایک دوسرے کی جانب کیسے دیکھیں اور کیا کہیں؟ قسمت نے اپنے ہاتھ سے کل ہمارا "باب" بند کرایا تھا اور آج بھی "کٹ" کروا رہی تھی جیسے ہم ابھی تک سکول کے لڑکے ہی ہوں۔ دنیا میں اور کتنے کرنے والے کام تھے' یہ ہندو مسلمان نے دو ملک بنا کر اپنے آپ کو کس مصیبت میں ڈال لیا ہے؟ مسخروں کی جوڑی کی طرح ڈرائیور اور فائر مین ہمارے درمیان آ کودے۔ سکھ فائر مین ہنس کر کہنے لگا "کیوں جی' دیکھ لیا اے پاکستان؟ چلو ہن چلئے اپنے انڈیا واپس۔" ان کی اس گھمنڈی بیوقوفی نے مجھے اور بھی کانٹوں میں گھسیٹا۔

کرنے والے کام تھے' یہ ہندو مسلمان نے دو ملک بنا کر اپنے آپ کو کس مصیبت میں ڈال لیا ہے؟ مسخروں کی جوڑی کی طرح ڈرائیور اور فائر مین ہمارے درمیان آ کودے۔ سکھ فائر مین ہنس کر کہنے لگا "کیوں جی' دیکھ لیا اے پاکستان؟ چلو ہن چلئے اپنے انڈیا واپس۔" ان کی اس گھمنڈی بیوقوفی نے مجھے اور بھی کانٹوں میں گھسیٹا۔

گاڑی چل دی۔ میں تن تنہا رہ گیا۔ ضمیر نے مجھے گواہوں والے کٹہرے میں کھڑا کر دیا اور جرح شروع کر دی:

ضمیر: اس وقت تو خوش ہے یا غمگین؟

میں: ہونا تو مجھے غمگین ہی چاہئے' لیکن میں خوش ہوں۔

ضمیر: تو پھر تو احمد راہی اور دوسرے دوستوں کے سامنے رنجور ہونے کا محض کردار ادا کر رہا تھا۔

میں: ہاں' میں صرف کردار ادا کر رہا تھا۔

ضمیر: تیرا کیا خیال ہے وہ بھی کردار ادا کر رہے تھے؟

میں: ہاں' ممکن ہے وہ بھی کردار ادا کر رہے ہوں۔

ضمیر: اس کا سبب؟

میں: میں صرف اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔

ضمیر: گھر سے کیا تیری مراد بمبئی ہے؟ تیرے گھر والے؟

میں: نہیں! گھر سے میری مراد ہے انڈیا۔۔ جیسا کہ فائر مین نے کہا تھا۔

ضمیر: انڈیا کیوں؟ ہند یا بھارت کیوں نہیں کہتا تو؟

میں: کیونکہ میں بھی اپنے اندر وہی گھمنڈ سا محسوس کر رہا ہوں جس کا اظہار اس فائر مین نے کیا تھا۔ میرا بھی اس جیسوں کی صف میں کھڑا ہونے کو جی چاہتا ہے۔

ضمیر: اچانک یہ تبدیلی کیسے؟ کیا راولپنڈی' بھیرہ اور لاہور پر تجھے فخر نہیں؟ کیا تجھے ان کو چھوڑ جانے کا دکھ نہیں؟

میں: نہیں! اس وقت مجھے ایک عظیم اطمینان محسوس ہو رہا ہے' وہ یہ کہ چاہے میرا شہر مجھ سے چھن گیا' میرا ملک مجھ سے نہیں چھنا۔ میں انڈین پیدا ہوا تھا' اب بھی انڈین ہوں اور انڈین ہی مروں گا۔۔۔۔۔۔ اس سے بڑی چیز اور کوئی نہیں۔

ضمیر: یہ تو جنون والی بات ہو گئی۔ مذہبی جنون نے جو پھول کھلائے ہیں' وہی تیرا یہ قومی جنون بھی کھلا سکتا ہے۔ یورپ کی عظیم جنگیں اسی قومی جنون نے ہی تو کرائی ہیں: My Country right Or Wrong (اپنے ملک کی خاطر مر مٹنا ہے' چاہے وہ سچا ہے یا جھوٹا)۔ لے' میں تیرے خیالات کا خلاصہ کر دوں۔ جن لوگوں نے سامراج سے لڑ کر آزادی حاصل کی انہوں نے ہی تیرے ملک میں حکومت بنائی۔ جو آدمی پہلے دن وزیر اعظم بنا' وہی آج بھی وزیر اعظم ہے۔ جو پالیسیاں اس نے پہلے دن کے سامنے پیش کیں وہی آج بھی تیرے ملک کی کامیاب پالیسیاں ہیں۔ تیرے ملک کے سامنے ایک نظریہ (آدرش) ہے۔ وہ صرف ایک ذات ایک مذہب کے مفاد کی خاطر نہیں۔ وہ ساری انسانیت کے فائدے کے لئے ہے۔ اس نشان کی جانب بڑھ کر تیرے ملک نے اپنی آزادی کو قائم رکھا اور مضبوط بنایا ہے۔ اپنے تہذیبی اور فنی ورثوں کو سنبھالا ہے۔ صنعت میں ترقی ہوئی ہے۔ مزدوروں کسانوں کو سہولیات ملی ہیں۔ جمہوری حقوق ملے ہیں' سر اٹھا کر چلنے کی کامیابی ہوئی ہے۔ تو نے دیکھا نہیں لدھیانہ میں کیسے گھر گھر مشینیں چل رہی ہیں؟ مانا کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ نہرو کا نظریہ کمیونزم فی الحال صرف خواب ہی لگتا ہے' لیکن اس نے ملک کے لوگوں کو ایک نیا شعور دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مذاہب' ذات پات اور برادریوں کے تعصبات سے بلند تر ہو کر بھرپور ملکی یکجہتی قائم کرنے کی راہ بتائی ہے۔ مزدوروں کو اپنی تنظیم سازی مضبوط کرنے کی آزادی ملی ہے۔ یہ سکھ فائر مین بھی تو ایک مزدور ہے۔ یہ ہنسی اس کے چہرے پر اچھی زندگی کے یقین کی پیدا کردہ ہے۔ وہی یقین تیرے اندر بھی ہے۔ تو اسی بات کی خوشی محسوس کر رہا ہے۔

لیکن مجھے ضمیر کی اس لیکچر بازی نے بھی زیادہ قائل نہ کیا۔ اگر "ملک پرستی" صرف ایک نشہ اور خود فریبی ہے تو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" بھی ایک نشہ اور فریب ثابت ہو سکتے ہیں۔ بچپن میں آریہ سماج کے رہنماؤں سے سن سن کر دل میں یقین بیٹھ گیا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح جنت میں چلی جاتی ہے۔ جب میری بہن فوت ہوئی تو میں نادانوں کی طرح آہیں بھرتا پھرتا تھا' "تم سب روتے کیوں ہو......" کیا پتہ میری خوشی کی وجہ صرف یہ ہو کہ اس وقت میرا دل اپنی جنم دھرتی کی پندرہ دن سیر کر کے مسرور ہے۔ میں مطمئن اور خوش ہوں۔ اس فراق کی اصلیت ابھی دل میں پیوست نہیں ہوئی۔ دیکھیں واہگہ پار کر کے کیا ہوتا ہے؟

واقعی اب خوشی دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی تھی۔ رسائی نارسائی میں تبدیل ہوتی

جا رہی تھی۔ واہگہ تو آنا ہی تھا۔ اسے آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اچانک آسمان جتنے بلند کالے سیاہ فولادی دروازے خوفناک دھماکے کے ساتھ آپس میں ٹکراتے اور بند ہوتے نظر آئے۔ میں اب ان سے باہر آ چکا تھا۔ اب میں پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میری حالت اسی آدمی جیسی ہو گئی جو غم غلط کرنے کی خاطر ٹکٹ خرید کر سینما میں جا بیٹھتا ہے۔ جتنی دیر فلم چلتی ہے اس کا دل بہلا رہتا ہے۔ شو کے اختتام پر وہ باہر آ جاتا ہے اور غم پھر اسے گھیر لیتے ہیں۔ دوستوں کے سامنے نہیں رویا تھا۔ اب کمپارٹمنٹ میں تنہا بیٹھا اشک بہانے لگا۔

☆☆☆

یوں' جیسے آیا تھا' بلراج ساہنی پاکستان سے رخصت ہو گیا۔ لیکن احمد راہی وہ سب بھول نہ سکا جو بچھڑتے وقت سٹیشن پر اس نے بلراج کے چہرے پر دیکھا تھا۔ ساری دوپہر اور ساری شام راہی کا کسی کام میں دل نہ لگا۔ رات کو بھی وہ کافی دیر تک سو نہ پایا۔ کسی حیلے بہانے اپنے دل کو پرسکون کرنے کے لئے اس نے بلراج کے نام ایک نظم لکھی اور اسی رات جا کر اسے سپرد ڈاک کر آیا:

بلراج ساہنی نوں!

تیرے لئی پردیس اے دیس میرا
میرے لئی پردیس اے دیس تیرا
چٹ دیہیا جو گیا وسدا رہ
ایتھے تیرا ڈیرہ اوتھے میرا ڈیرہ
نیر ڈلہدے جگ نے لکھ ویکھے
میں اوہ نیر ویکھے جہڑے ڈلھے وی نا
بھانویں اوہناں دا کسے نہیں مل پایا
موتی اکھیاں دے انمل وی نا
جہڑے قیداں دی یاد وچ بند ہوئے
اوہ دل قیدی کدے کھلے وی نا
جہڑے کہ ہواواں دے نال اڈے
اساں لکھ بھلائے اوہ بھلے وی نا
توں ہیں دیس گیوں کہ توں گیوں دیسوں
گیوں جدوں دا ایہو ہے سوچ مینوں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جھڑی سوچ نے کھس لئی نیند میری
جیون دیسی کدوں اوہ سوچ تینوں؟
بیڑی اساں دی اوہ دریا ڈبی
کجھ ڈب گئے کجھ ترے وی نا
میری پیڑ دے اصلی سانجھیا اوئے
تیرے زخم ہرے میرے بھرے وی نا
میرے دیس وسیندے پردیسیا اوئے
جہڑا درد میرا اوہ درد تیرا
ایتھوں جاندیاں چیکی سی روح تیری
اوتھوں آندیاں رویا سی دل میرا
ایدوں ودھ کے ہور کی دکھ ہوسی
تیری اکھ اینتھے میری اکھ اوتھے
ٹٹے دلاں دا کی شمار کریئے
ایہو جیہا اجاڑیا آلہنا نہیں
کوئی ککھ اینتھے کوئی ککھ اوتھے۔

(26 اکتوبر' 1962ء۔ رات گیارہ بجے)

(بلراج ساہنی کے نام—— تیرے لئے میرا دیس پردیس اور میرے لئے تیرا۔ سفید بھیس والے جوگی تو آباد رہے' یہاں تیرا ڈیرہ وہاں میرا۔ دنیا نے لاکھوں اشک بہتے دیکھے' لیکن میں نے ایسے بھی دیکھے جو بہے نہیں۔ چاہے کسی نے ان کی قدر نہ کی لیکن آنکھوں کے موتی بے قدر بھی نہیں جو زندان یاد میں محبوس ہوئے وہ قیدی دل کبھی آزاد بھی نہیں ہوئے' جو باد وقت کے ساتھ اڑتے ہیں۔ ہم نے لاکھ بھلایا مگر وہ نہ بھولے۔ تو دیس گیا یا دیس سے گیا' تیرے جانے کے بعد سے یہی سوچ رہا ہوں۔ جس سوچ نے میری نیند ضبط کر لی وہ تجھے بھلا کب جینے دے گی؟ ہماری کشتی بیچ دریا میں ڈوبی' کچھ ڈوب گئے اور کچھ تیرے بھی نہیں۔ اے میرے سچے ہم درد' تیرے زخم ہرے ہیں اور میرے زخم بھرے نہیں۔ میرے دیس میں بسنے والے پردیسی' جو درد میرا وہ تیرا بھی ہے۔ یہاں سے جاتے وقت تیری روح تڑپی تھی وہاں سے آتے وقت میرا دل رویا تھا۔ اس سے بڑھ کر دکھ اور کیا ہو گا' تیری نظر یہاں میری نظر وہاں۔ شکستہ دلوں کا کیا شمار کریں' کئی لاکھ یہاں اور کئی لاکھ وہاں ہیں۔ ہمارا گھونسلہ ایسا اجاڑا ہے کہ کوئی تنکا یہاں اور کوئی وہاں ہے۔ مترجم)

پھر.......

بمبئی۔ 9 جولائی' 1967ء.....

جلوس نکل رہا ہے۔ خلافت ہاؤس سے۔

میز پہ کھڑے ہو کر ایک رہنما ہدایات دیتا ہے۔ جلوس چار چار کی قطاریں بنا کر چلے گا۔ نعرے صرف وہی مارے جائیں گے جن کی لسٹ رضاکاروں کو دی گئی ہے۔ جیسے کہ ---

اسرائیل مردہ باد
اینگلو امریکن سامراج مردہ باد
صدر ناصر زندہ باد
صحرائے سینائی چھوڑ دو
بیت المقدس چھوڑ دو

پھر پلے کارڈ بانٹے' کالے جھنڈے ہاتھ میں پکڑائے جاتے ہیں۔ چاہے کتنی ہی بارش ہو کسی نے چھتری نہیں کھولنی' اور نہ ہی لائن توڑنی ہے۔ اندازاً" دو ہزار افراد موجود ہوں گے۔ اس میں ہندو صرف دو ہیں۔ ایک سری گنگا رام جوشی جو بمبئی کے میئر رہ چکے ہیں اور دوسرا میں۔ باقی تمام مسلمان۔ ایک عورت بھی ہے۔ میرے دوست' مشہور شاعر علی سردار جعفری کے پاس کھڑی باتیں کر رہی ہے۔ جامنی رنگ کی ساڑھی اس کے گورے سڈول بدن پر خوب پھب رہی ہے۔ سرو قد' بھورے بھورے بالوں کی لمبی چٹیا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے' لیکن کب اور کہاں' یاد نہیں۔ لیکن مسلمان ہے' اتنا ضرور جانتا ہوں۔

پھاٹک سے باہر آ کر جلوس کو ترتیب دینے کی کوشش کی جاتی ہے' لیکن بے معنی۔ خود رضاکاروں میں تنظیم اور خود یقینی کا نام و نشان نہیں۔ باقی لوگ بھی یوں نکل پڑے جیسے انہیں معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ ایک اقلیت کا جلوس ہے' ایک ایسی اقلیت جو پاکستان بننے سے بیٹھے بٹھائے اپنے ملک میں اجنبی ہو گئی ہے۔ وہ کسی ایسے درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں کاٹ دی گئی ہوں۔ دو عشروں سے وہ زندگی سے کٹ کر ایک گوشے میں پڑی ہے۔ اس اقلیت کو مظاہرے کرنے' اپنے حقوق مانگنے' جلوس نکالنے کا ہنر کب سے بھول چکا تھا۔

آج پاکستان میں مسلمانوں کے جلوس نکل رہے ہوں گے، میں نے سوچا۔ لیکن وہ علیحدہ قسم کے مسلمان ہیں۔ اکثریت والے، محفوظ، حقوق کے مالک، مضبوط اور طاقت ور۔ انسانی تحفظ نہ ہو تو چہرے پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ ان جلوسوں کی اور ہی شان ہو گی۔ انتظام بھی ٹھاٹھ کا۔ بلند آہنگ ترانے۔ نعرے لگانے کے لئے کسی کو اکسانے کی ضرورت نہیں پڑتی ہو گی، جیسے یہاں ہے۔

آگے والی صف میں علی سردار جعفری، میں، گنگا رام جوشی، وہ عورت، کا مریڈ صاحب اور کچھ اور لوگ شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔ جب بھی پیچھے رہ جائیں تو پچھلی قطار والے دھکیل کر پھر آگے کر دیتے ہیں، جیسے جلوس کی ذمہ داری ہم پہ ڈال رہے ہوں۔ انہیں ہم سے حوصلہ ملتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند ہونے کی انہیں قدر و اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔ ہمیں بھی اس بات کا فخر ہے۔

کیا پاکستانی جلوسوں میں بھی کوئی ترقی پسند فنکار اگلی صفوں میں چل رہے ہیں، میں نے قیاس کیا؟ کیا علی سردار جعفری کی طرح میرا ہم جماعت فیض احمد فیض بھی کسی جلوس کی رہنمائی کر رہا ہو گا؟ کہیں وہاں کے ترقی پسند ابھی تک خوفزدہ اقلیت تو نہیں؟

اقلیت پر برستا ہوا سامراجی قہر ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے کچھ زیادہ نہیں برداشت کیا۔ وہ ان کے تصور سے بالاتر چیز تھی۔ لیکن وسط ایشیائی ممالک ہمارے پڑوسی ہیں۔ عربوں کے ساتھ زمانوں سے ہماری تہذیبی اور نظریاتی سانجھیں ہیں۔ ان پر نازل ہونے والی اذیت کا اثر مخصوص ہے، خاص طور پر مسلمان بھائیوں پر۔ سامراج بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے۔

ماضی میں ہماری قومی تحریک سامراج کے خلاف جدوجہد کرتی آئی ہے۔ اندرا گاندھی کے خاندان نے تین پشتوں سے اس لڑائی میں قربانیاں دی ہیں۔ اس کا باپ اور صدر ناصر بازو میں بازو ڈال کر ایک ساتھ چل چکے ہیں۔ نہر سویز کے حملے کے وقت نہرو نے ناصر کا ساتھ دیا تھا اور گوآ کے وقت ناصر نے سویز نہر میں سے پرتگالی جہازوں کا گزرنا فوراً بند کر دیا تھا۔ اس وقت حکومت ہند کا عربوں کی مدد کو آنا اسی روایت کا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ صدر ناصر یا عربوں کے مسلمان ہونے کا کوئی تعلق نہیں۔

کیا حکومت پاکستان اور عوام بھی اس مسئلہ کو سیکولر انداز میں دیکھتے ہیں۔ یا پھر کہیں "اسلام خطرے میں ہے" کی حد تک پہنچ کر ہی رک جائیں گے؟ کیا پاکستان اس قوم کو دیکھ کر سیٹو سینٹو جیسی سامراجی چالوں میں سے نکل آنے کا حیلہ کر سکے گا؟ عدن اور عرب اپنی دھرتی سے انگریزی فوجی اڈے ختم کرنے کے لئے لہو بہا رہے ہیں۔ کیا پاکستانی بھی اپنی سرزمین

سے امریکی فوجی اڈے ختم کرنے کا مطالبہ کریں گے؟

وقت کے خود رو بہاؤ نے ہندوستان اور پاکستان کو ایک ہی قطار میں لا کھڑا کیا ہے۔ کیا وہ اس موقعہ کی تاریخی اہمیت کو شناخت کریں گے؟ کیا گہرے تفکر کے ساتھ اپنی سابقہ پالیسیوں پر خود تنقیدی کریں گے؟ کیا آئندہ کے لئے کوئی ایسی راہ اختیار کریں گے جس کے ساتھ اس محاذ کو اور بھی مضبوط بنایا جا سکے؟

کیا ہمارے لیڈر اب دیکھ سکیں گے کہ سامراج آج عربوں کے ساتھ وہی کچھ کر رہا ہے جو اس نے ہمارے ساتھ 1947ء میں کیا تھا؟

پہلی جنگ عظیم کے بعد، ترکی کی شکست کے باعث، انگریز فلسطین کے ضامن، بن گئے۔ اس وقت وہاں یہودیوں کی تعداد آٹے میں نمک برابر تھی۔ ہزاروں سال سے وہ عربوں کے ساتھ عرب بن کر رہتے آئے تھے، ایک ہی زبان، ایک ہی لباس، ایک ہی رہن سہن اور ثقافت و تہذیب۔ لیکن انگریزوں کو معلوم تھا کہ ان کی ضمانت ہمیشہ نہیں چلے گی۔ ایک نہ ایک دن فلسطین چھوڑنا ہی پڑے گا۔

لیکن ایک مرتبہ قبضہ کرنے کے بعد سامراج آسانی سے تو آزادی نہیں دیتا، بالخصوص ایسی دھرتی کو جو پٹرول جیسی بیش بہا دولتیں اگل رہی ہو؟ ایسے وقت میں اسے نفاق ڈالنے والی پالیسیاں سوجھتی ہیں، تاکہ ایک ہاتھ سے دیا ہوا دوسرے ہاتھ سے واپس لیا جا سکے۔ لیکن نفاقی پالیسیوں پر عمل کرنے کے لئے پہلے تو یہودیوں کی تعدادی نابرابری دور کرنا لازمی تھی۔ اسی مقصد کے پیش نظر اور طرح طرح کے لالچ دے کر، یورپی ممالک میں سے ہزاروں کی تعداد میں یہودیوں کو فلسطین میں لا کر آباد کیا گیا۔ تفرقہ بازی کی آگ جلانے کے لئے عربوں کو دھکے دے دے کر گھر سے بے گھر کیا۔ ہٹلر کی بربریت نے کام مزید آسان کر دیا۔ فلسطین میں یہودیوں کی تعداد دیکھتے دیکھتے بیس ہزار سے بیس لاکھ ہو گئی۔ یورپ کے اعمال کا معاوضہ عربوں کو ادا کرنا پڑا۔

لیکن ایک اعتبار سے عربی لیڈر ہمارے لیڈروں سے سیانے ثابت ہوئے۔ پہلے دن سے لے کر آج تک انہوں نے سامراج کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی۔ کبھی فلسطین کی تقسیم کو قبول کیا اور نہ ہی قیام اسرائیل کو۔ دنیا چاہے انہیں درست قرار دے یا غلط، وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہونے پر تیار نہیں۔ یہاں تک کہ انہیں شکست خوردہ دیکھ کر بھی دنیا کے لئے انہیں شکست خوردہ کہنا مشکل ہو رہا ہے۔

اس کے مقابلے میں ہماری اپنی کارکردگی کیا ہے؟ ہم جو عربوں کی ہمدردی میں جلوس

نکل رہے ہیں؟

ہمارے لیڈروں نے تو انگریز سامراج کے سامنے خود ہی گھٹنے ٹیک کر ملک کے بٹوارے کا مطالبہ کیا؟ تقسیم کی حدود بھی ایک انگریز کے ہاتھوں سے متعین کروائی گئیں؟ سامراج کو دوست بنایا اور اپنے بھائیوں کو دشمن' جن کے ساتھ ناخن اور گوشت والا رشتہ تھا' جن کے ساتھ ہم زمانوں سے ایک خاندان کی صورت میں رہتے آئے تھے۔ اسی پر بس نہ کی' بلکہ ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے ہی مٹانے پر تل گئے اور آج تک تلے بیٹھے ہیں۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو اور کسی سے اتنی نفرت نہیں جتنی ایک دوسرے سے.......

لگ بھگ تقسیم ہندوستان کے وقت ہی جرمنی' کوریا' چین اور ویت نام وغیرہ ممالک بھی تقسیم کئے گئے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنی تقسیم کو ابدی تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اپنی سانجھی روایت اور قومیت کی بنیاد پر وہ کبھی نہ کبھی پھر ایک ہو جانے کے کھلم کھلا دعوے کرتے ہیں۔ لیکن پاکستان اور ہندوستان میں اگر کوئی شخص دوبارہ ایک ہو جانے کی بات کرے تو وہ غدار ہے' ملک دشمن ہے۔

یہ جلوس نکال کر ہم عرب مہاجرین کو ہمت دلا رہے ہیں۔ لیکن کبھی ہمارا دل ان بدنصیبوں کے لئے بھی تڑپا ہے جن کی زندگی سرحد کے اس پار اور اس پار جیتے جی موت برابر ہو گئی ہے؟ ان کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ اکیلا فلسطین کیا تمام کے تمام عرب ممالک اس میں سما سکتے ہیں۔

یہ جلوس بھی تو ایسے ہی مہاجرین کا ہے۔ یہ آج اپنا دکھ بھلا کر عربوں کے دکھ میں شریک ہو رہے ہیں۔ کیا انہیں اپنی ناحق حالت کا احساس نہیں؟

میں خیالات میں ڈوبا ہوا چلتا جا رہا ہوں.....

جلوس ہے بھی مسلمانوں کا اور گزر بھی مسلمان علاقوں میں سے رہا ہے۔ جیسے بمبئی کا اپنا علیحدہ پاکستان ہو۔

ناگپاڑہ اور مدن پورہ کا چکر لگا کر جلوس محمد علی روڈ پہنچا۔ اب تعداد دو ہزار سے بڑھ کر دس ہزار' شاید اس سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ کوئی آخری سرا نظر نہیں آتا اور اسی کی مطابقت میں حوصلے بھی مضبوط ہو گئے ہیں۔ اجتماعیت کے احساس نے انسانی خود تحقیری کے احساس پر عارضی غلبہ پا لیا ہے اور اسی مقدار میں سیاسی نعروں کی جگہ مذہبی اور شخصی نعروں نے لے لی ہے:

نعرۂ تکبیر' اللہ اکبر

اسلام زندہ باد

بیت المقدس ہمارا ہے

صحرائے سینائی' لے کے رہیں گے

ایس۔ کے پاٹل چور ہے

جارج فرنانڈز دھوکے باز ہے

جلوس کے رہنما اس تبدیلی پر خفا ہیں' ان نعروں کو ناپسند کر رہے ہیں۔ وہ گھور گھور کر اردگرد دیکھتے ہیں' کبھی کبھی واضح الفاظ میں ٹوک دیتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی غلط فہمی پیدا ہو' کسی کی دل آزاری ہو۔ لیکن صورتحال ان کے قابو سے باہر ہے۔ کوئی فائدہ نہیں کسی کو منع کرنے کا۔ ہزاروں کے مجمع میں کس کس کو منع کریں گے؟

نعرے لگانے والوں کا بھی کیا قصور ہے جب کسی نے ان کی ذہنی سطح کو زندگی کی حقیقتوں تک لانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ آج ایک لیڈر اور کل دوسرے کے پیچھے دوڑ پڑنا' آج ایک کو اور کل دوسرے کو گالیاں دینا' ان کی سیاسی فہم اسی حد تک محدود رہتی ہے۔ کیا کسی نے تردد کیا ہے انہیں عرب اسرائیل جھگڑے کے بنیادی رموز بتانے کا؟ عرب مسلمان ہیں' یہ بھی مسلمان ہیں' بس یہاں بات ختم ہو گئی۔ جن لیڈروں کی یہ تقریریں سنتے ہیں' جن عقل مندوں کو چراغ راہ مانتے ہیں' جن اخبارات کا صبح اٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں' انہوں نے بس اتنا ہی بتایا ہے۔

اسی طرح ہندو اخبارات نے اسرائیل کی حمایت صرف اس لئے کی ہے کہ وہ مسلم "ملیچھوں" کے دانت کھٹے کر رہا ہے۔ سب مسلمان ایک ہی رسے سے پھانسی دینے کے قابل ہیں' چاہے عرب ہوں' چاہے ہندوستانی یا پاکستانی۔ یہ نہرو خاندان تو ہمیشہ سے سانپوں کو دودھ پلاتا آیا ہے۔ اسی وجہ سے اندرا گاندھی نے ایک مسلمان کو راشٹرپتی کے عہدے پر فائز کر دیا ہے۔ بھلا اس کی بہو آج بھی تو ایک مسلمان کے ساتھ بھاگ جانے کے سپنے نہیں دیکھا کرتی تھی؟

اگر عوام کے خیالات فرقہ پرستی سے آزاد ہو چکے ہوتے تو کیا یہ صرف مسلمانوں کا جلوس ہوتا؟ اس میں ہندو نہ ہوتے' سکھ نہ ہوتے' پارسی عیسائی نہ ہوتے؟ ان کو شامل ہونے سے کسی نے روکا تو نہیں تھا۔ اگر روکا جاتا تو تب بھی کیا پرواہ تھی' جب کہ جلوس کا مقصد اپنے ملک کی پالیسیوں کی حمایت کرنا ہے؟

یہ کروڑ پتی سرمایہ داروں کے اخبارات ہیں۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے تھے۔

عوامی تحریکیں آج بھی انہیں اتنا ہی ناگوار گذرتی ہیں جتنی پہلے گذرتی تھیں۔ آزادی اور انصاف کی خاطر لڑنے والوں کو یہ تب بھی فسادی اور شورش پسند کا لقب دیتے تھے اور آج بھی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے مطابق امریکہ چھوٹے سے ملک ویتنام کو پاؤں تلے مسل نہیں رہا' اسے کیمونزم سے بچا رہا ہے۔ چاہے ساری دنیا کے مدبر اور پالیسی ساز اور خود امریکہ کے عوام تھو تھو کر رہے ہوں لیکن ان اخبارات کی سامراجی خبر رساں ایجنسیوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ امریکی شہروں میں لوٹ مار نیگرو ہی کرتے ہیں' بیچاری پولیس ہمیشہ ان کے ہاتھوں گھائل ہی ہوتی ہے۔ امریکی ہوائی جہازوں کے برسائے ہوئے بموں سے جتنے بھی ویتنامی مرد عورتیں بچے مرتے ہیں وہ سب کیمونسٹ ہی ہوتے ہیں...... سچائی پر پردہ ڈالنے کے جو چلتر ان بڑے بڑے اخبارات کو آتے ہیں کیا اس کا کوئی حد حساب ہے؟ ان چلتروں کی کامیابی کا ثبوت اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ انگریزوں کی غلامانہ روایات کو بدستور قائم رکھنا بھی ان اخبارات کی راستی اور غیر جانبداری کا مظہر بن گیا ہے۔

بھارتی کروڑ پتیوں کو انگریز اور امریکی کروڑ پتیوں کی بغل میں بیٹھنے کا شوق ہے۔ پھر ان کے اخبارات سامراج کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں؟ سامراج اسرائیل کا حمایتی ہے' یہ سامراج کے حمایتی ہیں۔ یہ عربوں کے حمایتی کیسے ہوں جب کہ مصر' الجیریا' شام اور عراق جیسے ممالک سرمایہ داری کی راہ ترک کر کے کیمونزم کی راہ اختیار کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں؟ اسی قصور کی وجہ سے ہی تو ان اخبارات نے حملہ آور کو مظلوم اور مظلوم کو حملہ آور بنا دیا ہے۔

دراصل فرقہ پسند اخبارات بھی تو' جنہیں "جاہل" عوام پڑھتے ہیں ان کروڑ پتیوں کے ہی ہیں۔ جیسا منہ دیکھتے ہیں ویسا ہی تھپڑ مارتے ہیں۔

یہی کروڑ پتی انتخابات میں اپنے زر خرید نمائندے کھڑے کرتے ہیں۔ بڑے بڑے افسروں اور وزیروں کے ناک میں نکیل ڈالتے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈر' بڑے دانشور' بڑے بڑے پنڈت' بڑے بڑے ملا' انہی کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔

تقسیم ہند کے پیچھے اس کروڑ پتی طبقے کا کتنا ہاتھ رہا ہے' یہ تو تاریخ بتائے گی' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کی چاٹی میں سے مکھن نکال نکال کر اس طبقے نے ہی کھایا ہے۔ غریب عوام نے ایک دوسرے کا خون نچوڑنے کے سوا ابھی تک کچھ حاصل نہیں کیا!......

اب ہجوم کا کوئی شمار نہیں۔ ٹریفک جام ہو چکا ہے۔ پولیس افسروں اور سپاہیوں کو بھی

پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ بلڈنگوں کی چھتوں' کھڑکیوں' بالکُنیوں سے' سڑک کے دونوں کناروں سے لوگ اُمڈ اُمڈ کر آ رہے ہیں۔ جس فنکار کو وہ بھانت بھانت کے روپ میں سینما کے پردے پر دیکھتے ہیں' ان کے درمیان پیدل چلتا جا رہا ہے۔ ان کے لئے یہ بہت انوکھی بات ہے۔ ہر چہرے پر محبت ہے' مسکراہٹ ہے۔ اس پیار کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کا کوئی مذہب نہیں۔ اس کا تعلق صرف انسانی دل سے ہے' جذبات سے ہے اور جاہل' عوام کے دل میں پیار کے لئے اتنی جگہ ہے کہ اس میں ساتوں سمندر سما سکتے ہیں۔

کس مذہب کا بانی مجسم محبت نہیں تھا؟ اگر مجھے غلطی نہیں لگ رہی تو قرآن شریف میں آیا ہے کہ جو شخص ایک انسان کا خون کرتا ہے وہ دراصل ساری بنی نوع انسان کا قاتل ہے۔

کیا میرے اپنے پنجاب کے عظیم انسان گورو گوبند سنگھ نے' جس کا سارا خاندان مسلمان حاکموں کے ہاتھوں شہید ہوا تھا' بھی مذہبی رواداری کا درس نہیں دیا تھا؟

فرنگی کے جال میں پھنس کر ہم نے اپنے ملک کی خوبصورت روایات کیسے بھلا دی ہیں!

کچھ عرصہ پہلے میں چتوڑ کا قلعہ دیکھنے گیا تھا' جس کا چپہ چپہ راجپوتوں کے ساتھ پٹھانوں' ترکوں اور مغلوں کی لڑائیوں سے خراش خراش ہے۔ یہاں ایک فتح کا ستون دیکھا جو کسی رانے نے بارھویں یا تیرھویں صدی میں بنوایا تھا۔ اس پر ہر جگہ شیو' برہما اور ایشور کا ہر نام ایک جتنا ہی مقدس تھا۔ بادشاہت کے لڑائی جھگڑوں کا رب کے نام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

وہیں میرا بائی کا مندر بھی دیکھا جس کے لکھے ہوئے بھگتی گیت حضرت نظام الدین اولیاء اور ان کے علاوہ کتنے ہی صوفی پیرومرشد سن سن کر سر دھنتے اور وجد میں آتے تھے۔ امیر خسرو بھی ان میں سے ایک صوفی مرید تھے' جنہوں نے ہماری موسیقی کو 'خیال' کی خصوصیت عطا کی۔ کیا اس میں بھی ہم کسی ریڈ کلف کے ہاتھوں تقسیم کی لکیر کھنچوا سکتے ہیں۔

تلسی داس کی رامائن ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتاب ہے۔ لیکن تلسی داس کو اسے لکھنے کی رغبت ایک مسلمان شاعر سے ملی' جس کا نام تھا ملک محمد جائسی' جائسی کا لکھا ہوا "پدماوت" ہندی ادب میں سب سے پہلی عظیم شاعری ہے۔ جائسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہی تلسی نے رام کے انسانی تصور کو موضوع بنایا تھا!

اسی طرح اردو رتن ناتھ سرشار، فراق گورکھپوری، سورج نرائن مہر، پریم چند اور کرشن چندر کی زبان ہو گئی ہے۔

سنسکرت جبراً شامل کر کے ہندوستان میں ہندی کو غیر خالص بنا جا رہا ہے، جب کہ پاکستان میں اردو کا گلا فارسی کے ذریعہ دبایا جا رہا ہے!

یہ فرنگی ہمارے دلوں میں کیسے کیسے وہم داخل کر کے چلا گیا! مسلمان گوشت کھاتے ہیں، اس لئے طاقتور اور بہادر قوم ہیں۔ ہندو دھوتی باندھتے ہیں، اس لئے کمزور اور پتلے دبلے ہیں! نجانے اس وقت پاکستانی پنجاب کے مسلمانوں کی حیرت کا کیا عالم ہو گا جب شروع شروع میں دھوتی باندھنے والے مسلم مہاجر یہاں سے ادھر گئے ہوں گے؟ بمبئی میں ایک مرتبہ فسادات کے دوران ہندو کرشن چندر کو چھرا مارنے لگے تھے کیونکہ اس نے شلوار پہن رکھی تھی۔ اس وقت تک یہاں کے ہندوؤں کو یقین تھا کہ شلوار اسلامی لباس ہے۔ جب ہزاروں شرنارتھی "بھاپے" "گرانٹ روڈ" کلیان اور سائن کو لیواڑا میں خوار ہونے لگے تو تب کہیں جا کر گجراتیوں مراٹھیوں کو معلوم ہوا کہ شلوار کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

مدراس کے مسلمانوں نے کالی روئیں دار ٹوپی اور رنگین تہمد کو اسلامی لباس قرار دے کر دم لیا۔ جب ان سے کوئی کہے کہ ٹوپیاں اور رنگین تہمدیں پنجاب کے ہندو بھی بڑے شوق سے پہنتے ہیں تو وہ حیران ہوتے ہیں۔

کیا ہمارے آباؤ اجداد نے بھی کبھی زبان، خوراک یا لباس کے معاملات میں مذہب کو گھسیڑا تھا؟ پرانی مصوری کو دیکھیں، پرانی کتابیں پڑھیں، صاف پتہ چل جائے گا کہ ہندوستان کے ہر علاقے کی اپنی ساجھی بولی، سانجھا لباس اور سانجھا رہن سہن ہوتا تھا۔

پنجاب کی اپنی بولی تھی۔ شیخ فرید، گورو نانک، وارث، بلھے شاہ، دمودر، ہاشم، قادر یار، شاہ محمد--- سبھی پنجابیوں کے دلوں کے تار چھیڑتے تھے، کسی ایک جماعت کے نہیں۔ اور وہ سدا یہ تار چھیڑتے رہیں گے!

گنگا جمنا والے علاقے کی بولی ہندوستانی تھی، چاہے اسے ہندی کہہ لیں یا اردو، غالب، میر، سور داس، تلسی داس، میرا بائی اس علاقے کے لوگوں کا مشترک ورثہ ہیں۔ اور سدا رہیں گے۔

کوئی بھی پنجابیوں سے پنجاب نہیں چھین سکتا اور نہ ہی گنگا جمنا علاقہ کے لوگوں کو پیچھے دھکیل کر کوئی اور اردو ہندی کا ٹھیکیدار بن سکتا ہے۔ ایں خیال است و محال است و جنوں است!

لیکن فرنگی کو داد دینا پڑتی ہے۔ کسی تدبیر کے ساتھ زبان کے معاملے میں مذہبی تعصب کا زہر گھول کر انہوں نے صرف دو حصوں کو نہیں بلکہ سارے ملک کو تگنی کا ناچ نچوا دیا۔ ہماری عقل پہ پردہ ڈال کر کتوں کی طرح ہم سے ایک دوسری کی آنتیں نکلوائیں۔

آج ہم آزاد ہو کر بھی بے سوچے سمجھے جھوٹی اور بے ڈھنگ راہوں پر بھٹک رہے ہیں۔ جرمن فلاسفر برگساں نے ایک جگہ کہا ہے کہ اگر پہاڑ سے گرتے ہوئے پتھر میں دانائی ہو تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ میں گر رہا ہوں۔ بلکہ وہ کہے گا کہ میں سیر کرنے جا رہا ہوں۔ بس یہی حال ہمارا ہے۔ ہماری عقل پر بھی ویسے ہی پتھر پڑ گئے ہیں۔ گھر پھونک تماشا دیکھ، یہی ہمارا نظریہ حیات بن گیا ہے......

اس جلوس میں بھی واہموں کی علامات واضح نظر آ رہی ہیں۔ ہر کوئی نہایت شستہ اردو بولنے کے مضحکہ خیز جتن کر رہا ہے، حالانکہ خال خال آدمیوں کو چھوڑ کر یہاں کسی بھی شخص کی مادری زبان اردو نہیں۔ کوئی گجراتی ہے، کوئی مہاراشٹری، کوئی جنوبی بھارت کا۔ گھر میں چاہے یہ اپنی مادری زبان ہی بولتے ہوں لیکن باہر آ کر انہیں اپنی مادری قومیت اور مادری زبان کو قبول کرتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ خود کو اردو دان ظاہر کرنا اپنا فرض سا بنا لیتے ہیں۔ پٹھان کو اپنے پٹھان پن کی لاج نہیں۔ پنجابی مسلمان بھی خود کو دھڑلے سے پنجابی کہتے ہیں، اسی طرح بنگالی۔ کیونکہ اپنے اپنے علاقے میں ان کی اکثریت ہے۔ لیکن گجراتی، راٹھی یا تامل مسلمانوں سے پوچھیں کہ ان کی قومیت کیا ہے۔ عام طور پر وہ خود کو مسلمان بتائیں گے۔ اقلیت ہونے کے خوف سے وہ خود ہی اپنے آپ کو معاشرے سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ انہیں وہم ہے کہ اسی میں ان کی حفاظت ہے، ان کا اسلامی کلچر محفوظ رہتا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کلچر اور تحفظ دونوں کنوئیں میں گر پڑتے ہیں۔

اسلامی کلچر ہندوستان میں ڈیڑھ ہزار سال سے نشو و نما پا رہا تھا، ہر علاقے میں اس کی مشترکہ زبان کے توسط سے، فقیروں سنتوں کی بانی کے ذریعہ، عوام کے آزادانہ میل جول سے، شاعری اور سنگیت سے، مصوری اور فن تعمیر کے ذریعہ، مشترک جسمانی محنت کے ذریعہ۔

سب بہت سوچ سوچ کر، سنبھل سنبھل کے اردو بول رہے ہیں، کہیں انجانے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ کتابی سی، بے جان سے گفتگو ہو رہی ہے، اکھڑی اکھڑی، بھینچی بھینچی سی۔ اس میں کوئی رس نہیں۔ کوئی گرمائش نہیں، کوئی خوبصورتی نہیں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

(یہاں سے کچھ حصہ بوجوہ حذف کیا گیا ہے۔ مترجم)

ایک مرتبہ مجھے خیال آیا' ہندوستان کی تقسیم کہیں مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی خاطر تو نہیں کی گئی تھی؟ ایک ٹکڑا مشرق میں' دوسرا دو ہزار میل دور مغرب میں۔ تیسرا درمیان میں پھنسا ہوا۔ تینوں کا نہ کوئی میل نہ ملاپ۔ یہ تو یونہی سمجھ لیں کہ چھوٹے بھائی نے موروثی جائیداد میں سے اپنا حق مانگا اور بڑے نے دھکے دے کر اسے گھر سے ہی باہر نکال دیا ہو۔

جلوس کارفیرڈ مارکیٹ کا چکر لگاتا ہوا ال بازار کی تنگ سڑک سے گزر رہا ہے۔ گھروں والے جلوس کے شرکاء کے ساتھ جیسے یک قالب ہو گئے۔ نہایت روح پرور منظر ہے۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر ہمیں کوکا کولا' شربت اور چائے پلا رہے ہیں۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک خاندان اکٹھا مل بیٹھا ہو۔ ہزاروں دوست، چہروں کے عکس میرا دل منور کر رہے ہیں۔ عوام کو یوں گلے لگانے سے بڑھ کر خوشی کسی فنکار کو کیا مل سکتی ہے؟......

بمبئی کے مسلمانوں کو لاکھوں مبارک باد جنہوں نے سب سے آگے بڑھ کر اپنا سامراج مخالف فرض نبھایا۔ اگر شرمندگی ہے تو صرف اس بات پر کہ ہندوؤں نے اپنا فرض نہ پہچانا' حالانکہ حکومت ہند کی منصفانہ پالیسی کی تائید کرنے کے لئے انہیں سب سے آگے ہونا چاہئے تھا.........

میری نظر اڑ اڑ کر ہجوم کی جانب جاتی ہیں۔ ایک ایک مکان کو' کھڑکیوں اور چھجوں کے اوپر سے اڑے ہوئے ایک ایک چہرے کو میں غور سے دیکھتا ہوں۔ اس کی معصومیت' اس کی لاعلمی' اس کی بیچارگی مجھے نشتر چبھوتی ہے۔ گھپ اندھیرے' گندے' افراد سے بھرے ہوئے کمروں میں جہنم کی اذیت اٹھاتے ہوئے لوگوں کے پیلے پیلے کمزور کمزور چہرے۔ تنگدستیوں اور پریشانیوں کے مارے مرجھائے ہوئے' ہراساں پریشان چہرے۔ ضروری رونقوں اور سہولیات سے محروم اداس بچے۔ کتنا غریب' کتنا پسماندہ ہے میرا ملک۔ عمارتیں کیسے بوسیدہ ہو کر گرنے کو پر تول رہی ہیں۔ ایک مکان کو لکڑی کے شہتیروں کے سہارے گرنے سے باز رکھا گیا تھا۔ ہر روز ایسے مکانوں کے گرنے کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ کتنے ہی لوگ ملبے تلے چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں کی طرح دب کر مر جاتے ہیں۔ لیکن زندگی ویسے ہی چلتی جاتی ہے۔ ملک کو آزاد ہوئے بیس سال ہو گئے' لیکن پیلا ہاؤس اور ال بازار کی رہائش میں کوئی فرق نہیں آیا' بلکہ مزید کچیلی اور گندی ہو گئی ہے۔ البتہ عمارتوں کی شان

دس گنا بڑھ گئی ہے جن میں وزیر اور ان کے سرپرست رہتے ہیں۔

گرانٹ روڈ کا پل پار کر کے جلوس گوالیا ٹینک میدان پہنچا۔ آسمان کے سارے چھید کھل کر ہمیں بھگو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بارش رکی۔ جلسہ شروع ہوا۔ عوام گیلی زمین پر بیٹھ گئے۔ ہم لوگ سٹیج پر بچھی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ پتہ نہیں کل اس مجمعے میں سے کتنوں کو زکام ہو گا اور کتنوں کو فلو۔ نجانے کتنوں ہی کو دوا خریدنے کی بھی توفیق ہو گی یا نہیں۔

وہ حسین و جمیل عورت' جلوس کی اکلوتی لاڈلی' میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جلوس میں کافی دیر تک میری آنکھوں سے اوجھل رہی تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ تھوڑی دیر حاضری دے کر واپس اپنے گھر چلی گئی ہو گی۔ لیکن گرانٹ روڈ پر جب بھیڑ کم ہو گئی تو پھر اس کے درشن ہوئے تھے۔ اب اس نے ساڑھی کے اوپر پلاسٹک کا پتلا سا کوٹ' شاید راستے میں کسی سے مانگ کر' پہن لیا تھا' جس میں گیلے بالوں کی وجہ سے وہ اور بھی حسین لگنے لگی تھی۔ میں نے سارا وقت اپنے سر پہ کپڑے کا ایک سرخ ہیٹ پہنے رکھا تھا' جس کا رنگ بارش میں بہہ بہہ کر میری سفید بشرٹ کو رنگین کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بے تحاشا ہنس دی تھی' انگریزی میں کہنے لگی۔

"تم اپنا خاصا بندوبست کر کے گھر سے نکلے ہو۔ بوٹ بھی فوجی پہنے ہوئے ہیں۔"

"ہم فلم ایکٹروں کو جلوسوں کا بہت تجربہ ہے۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کی چپل ٹوٹ گئی ہے اور وہ پاؤں گھسیٹ کر چل رہی ہے۔ وہ بھی جلوس کے ساتھ پورے چھ میل پیدل چلی تھی۔ میں اسے بڑی عزت افزا نظروں سے دیکھنے لگا.........

تقریریں شروع ہوئیں۔ خالص مذہبی جوش والی بھی اور قدرے فکرمندانہ بھی۔ ایک نے کہا۔۔۔ "تاریخ شاہد ہے' یہ یہودی ہمیشہ مکار رہے ہیں........"

اور میرے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ پرایوں کے تو ہم سدا سے مددگار رہے ہیں۔ اپنے مددگار کب بنیں گے؟........

پھر وہ عورت خطاب کرنے کے لئے مائیک پر آئی۔ صاحب صدر نے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اس کا نام بیگم کمال احمد تھا۔

جب گھر واپس گیا تو "آرسی" کے مؤلف سردار پریتم سنگھ کی چٹھی ملی۔ اس میں انہوں نے میرے پاکستانی سفرنامے کو' جو کبھی "پریت لڑی" میں شائع ہوا تھا' پنجابی میں شائع

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

یہ سفرنامہ ہندی اردو میں سب کا شائع ہو چکا ہے۔ مجھے اس بات پر شرمندگی تھی کہ جس زبان میں میں نے لکھا اس میں پہلے شائع نہ ہوا۔ لیکن اس میں حیرت انگیز بات کیا تھی جب کہ آج بھی پنجابیوں کی اکثریت اپنی مادری زبان کو مہذب زبان کا درجہ دینے کو تیار نہیں؟ پنجابی میں چھپوانے کا شوق اب تک مر چکا تھا۔

لیکن آج کے واقعات نے اس شوق کو پھر جگا دیا۔ مجھے موقع مل گیا کہ کچھ نیا مسالہ بھر کر پنجابی ایڈیشن میں انوکھا پن پیدا کر دوں۔ اور میں نے پریتم سنگھ جی کا مشورہ قبول کر لیا۔

ہندی اردو کے ترجمہ شدہ ایڈیشنوں کو میں نے کسی شخص کی نذر نہیں کیا تھا' لیکن پنجابی ایڈیشن کا انتساب کرنے کے لئے آج وہ شخص مل گیا تھا۔

بڑے پیار' احترام اور مان کے ساتھ' اس نرالے جلوس کی یاد میں' میں یہ ناچیز کتاب بیگم کمال احمد کے نام کرتا ہوں۔

بلراج ساہنی اور شارب انصاری